تدبر حدیث

حصہ اول

مؤلف

ڈاکٹر سید محمد لقمان اعظمی ندوی

مترجم

مولانا شمس الحق ندوی

انتساب

اپنی شریک حیات

ثروت نشور واحدی

کے نام

جن کی مخلصانہ رفاقت اور جذبۂ تعاون وخدمت گزاری نے

ہماری علمی ودعوتی کوششوں میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

محمد لقمان الاعظمی الندوی

ترتیب

پیش لفظ (الشیخ عبدالعزیز محمد الصہیل) ۷
تقدیم ۱۳
تقدیم ثانی ۲۱
عمل کی قبولیت کا انحصار نیت پر ہے ۲۷
حلال و حرام ۳۵
طہارت جزوِ ایمان ہے ۴۱
دین خیر خواہی کا نام ہے ۵۱
نیکی کی دعوت اور بُرائی سے روکنے کی اہمیت ۵۷
توحیدِ رب کا تقاضا تو یہ ہے ۶۹
باہمی میل و محبّت کمالِ ایمان کی علامت ہے ۷۷
بندۂ مومن کی پریشانی دُور کرنے کا صلہ آخرت ہے ۸۵
مسلم معاشرے کا امتیازی نشان ۹۱
نفاق معاشرے کا مہلک مرض ہے ۹۹
ظاہر و باطن دونوں کا پاس و لحاظ ۱۰۹
بدعت کی مخالفت ۱۱۳

نیکی کے آسان راستے	۱۲۳
دین پر ثبات واستقامت	۱۳۱
نیکی اور گناہ	۱۳۷
اِسلام کے پانچ ارکان	۱۴۱
غُصّہ اور اس کے نقصانات	۱۵۱
جہاد اور جنگ کے محرّکات	۱۵۹
مواخات۔ اسلامی معاشرے کا امتیاز	۱۶۹
رشوت معاشرے کے لیے مہلک مرض	۱۷۷
اِسلام میں سود حرام ہونے کی حکمت ومصلحت	۱۸۳
کھانے پینے کے اسلامی آداب	۱۹۱
اِسلام میں حصولِ علم کی اہمیّت	۱۹۷
اچھوں اور بُروں کی صحبت کے اثرات	۲۰۵
والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کے طریقے	۲۱۱
مسلمانوں کے اخلاق	۲۱۷
سچّائی کے فائدے اور جھوٹ کے نقصانات	۲۲۳
جنّت کا آسان راستہ	۲۳۱
گُناہِ کبیرہ	۲۳۷
اچھّے مسلمان کی پہچان	۲۴۱
پہلی حدیث کے راوی : حضرت عمر فاروق رض	۲۴۷
دوسری حدیث کے راوی : حضرت نعمان بن بشیر رض	۲۴۹
تیسری حدیث کے راوی : حضرت ابومالک اشعری رض	۲۵۱

چوتھی حدیث کے راوی : حضرت ابورقیہ تمیم رضؓ	۲۵۳
پانچویں حدیث کے راوی : حضرت ابوسعید خدری رضؓ	۲۵۵
چھٹی حدیث کے راوی : حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ	۲۵۷
ساتویں حدیث کے راوی : حضرت انس بن مالک رضؓ	۲۵۹
آٹھویں، نویں حدیث کے راوی : حضرت ابوہریرۃ رضؓ	۲۶۱
دسویں حدیث کے راوی : حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضؓ	۲۶۲
بارہویں حدیث کے راوی : حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ	۲۶۴
چودہویں حدیث کے راوی : حضرت سفیان بن عبداللہ رضؓ	۲۶۶
پندرہویں حدیث کے راوی : حضرت نواس بن سمعان رضؓ	۲۶۷
سولہویں حدیث کے راوی : حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ	۲۶۸
اُنیسویں حدیث کے راوی : حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ	۲۷۰
اکیسویں حدیث کے راوی : حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ	۲۷۲
تیئسویں حدیث کے راوی : حضرت عویمر بن مالک رضؓ	۲۷۴
پچیسویں حدیث کے راوی : حضرت ابواُسید مالک رضؓ	۲۷۵
چھبیسویں حدیث کے راوی : حضرت ابوذر جندب بن جنادہ رضؓ	۲۷۶
ستائیسویں حدیث کے راوی : حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ	۲۷۷
اُنتیسویں حدیث کے راوی : حضرت ابوبکرہ ثقفی رضؓ	۲۷۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علیٰ رسول اللہ صلعم

پوری تاریخ اسلامی میں اسلام کے عَلم بردار اور شرعی قانون کے دونوں سرچشمے کتاب اللہ اور سنّت مطہّرہ کے مابین ایک ٹھوس اور مستحکم ربط و تعلق قائم ہے۔ اسی وجہ سے ہر جگہ اور ہر زمانے میں مسلمانوں سے ان دونوں مآخذ سے وابستہ رہنے کا ایک دائمی اور ابدی مطالبہ رہا ہے، اور انہیں دونوں سرچشمہ شریعت سے اس قوم مسلم کی انفرادیت کی صحیح صورت حال کی عکّاسی ہوتی ہے اور سچی تصویر سامنے آتی ہے جس سے زندگی کی تعمیر ہوتی ہے اور جس سے اس دنیا کی اقبالمندی وابستہ ہے۔

نوجوان اور نئی نسل کے درمیان بے داغ اور بے غبار و پُربہار اسلامی ثقافت کی نشر و اشاعت سے ادارہ "المرکز الخیری" کی دلچسپی ہمیشہ سے رہی ہے اس کے پیش نظر ادارے نے جناب ڈاکٹر محمد لقمان صاحب ندوی جو ان دنوں ٹریننگ کالج حائل میں محاضر کے منصب پر فائز ہیں، کی کتاب کو اپنے فنڈ سے نشر و اشاعت کے لیے منتخب کیا ہے۔

اِس کتاب کی انفرادیت اور خصوصیات

یہ کتاب جو ہماری موجودہ پیش کش ہے اکیڈمک اور علمی حیثیت سے بھی ممتاز ہے کیوں کہ مؤلف نے حدیثوں پر غور و خوض کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے

میں اور پھر ان کے لغوی و بلاغتی مطالعہ کی روشنی میں اُن کے اغراض و مقاصد اور نظریات و خیالات کو پیش کرنے میں علمی اسلوب کو اساس و بنیاد بتایا ہے۔ اور پھر چند حدیثوں سے اس کا موازنہ اور قرآن کریم کی واضح اور بین آیات سے اسے مدلّل کیا ہے اس پر علمی بحث کی ہے۔

انہوں نے حدیثوں سے فقہی مسائل کا بھی استنباط کیا ہے تاکہ سنّت کی اہمیت اور قانونِ شرعی کی حیثیت سے اس کا رتبہ و مقام عیاں ہو جائے۔ نیز اس کتاب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ مؤلف نے جن حدیثوں کا انتخاب اور ان کو اپنی کتاب میں جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے وہ حدیثیں سعودی حکومت کے ٹریننگ کالجوں کے نصاب درس میں داخل ہیں جہاں ان کالجوں سے علمی پیاس بجھانے والے نوجوانوں کو اس کتاب کی ضرورت پڑے گی اور ہر جگہ کے عام مسلمان بھی اس سے مستفید ہوں گے۔

اس کی امتیازی خصوصیت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مؤلف کتاب برادر مکرم جناب محمد لقمان صاحب اعظمی ندوی نے تعلیم کے مختلف مراحل میں مصروف رہ کر تعلیم و تربیت کے میدان میں نصف صدی گزار دی ہے۔ اور عالمِ اسلام کے مفکرین اور داعیوں کے تجربات سے استفادہ کیا ہے۔ اور ان سے تحقیقی معلومات کا عطر کشید کیا ہے اور اس نہج پر حدیثوں کا مطالعہ ایسا با مقصد اور علمی مطالعہ سمجھا جاتا ہے جو سنّت کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو اُجاگر کرتا ہے۔ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ سنّت نبوی ہی اسلام کا سرچشمہ ثانی ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے ان الفاظ میں حکم دیا۔ (یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته والله یعصمك من الناس) اے پیغمبرؐ! جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے

ہیں، سب لوگوں کو پہنچا دو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے (یعنی پیغمبری کا فرض ادا نہ کیا) اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔ (مائدہ : ٦٧)۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو آپؐ کو حکم دیا آپؐ نے اسے عملی جامہ پہنایا اور اسی پیغام رسانی کی تشریح میں آپؐ کی سنّت، آپؐ کے اقوال و افعال اور آپؐ کی شب و روز کی نشست و برخاست کا عملی پیکر منارۂ نور بنا۔ لہٰذا آپؐ کی سنّت قرآن کی مجمل آیات کی تفصیل اور مشکل آیات کے لیے بیان اور اس کے مختصرات کے لیے وضاحت کی حیثیت رکھتی ہے۔ سنت کی اسی اہمیت کی وجہ سے مسلمانوں نے اصل سرچشمہ کی حیثیت سے اس کے ساتھ اعتنا برتا، یہی وجہ تھی کہ موجودہ دور میں مستشرقین کو جب قرآن کریم کو مشکوک کرنے میں مُنہ کی کھانی پڑی اور اپنی کوشش میں انہیں بدترین ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے حدیثِ نبوی میں شک و شبہ پیدا کرنے کے لیے مکر و دجل سے کام لینا شروع کر دیا۔ اس جرم عظیم کے ارتکاب کی ذمہ داری یہودی مستشرق "جولد تسیہر" نے لی، اور اس نے اپنی تصنیف (دراسات محمدیہ) کی جلد ثانی میں "بطور حدیث" کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے یہ باطل دعویٰ پیش کیا ہے کہ حدیث ان انقلابات اور بدلتے ہوئے حالات کا نتیجہ اور پرتو ہے جن کا مشاہدہ اسلامی معاشرے نے اپنی ابتدائی دو صدیوں میں کیا ہے اس کے نظریے کے خلاف یہ کتاب ایک منہ توڑ جواب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مؤلف کو یہ توفیق عطا فرمائی کہ انہوں نے اپنے وقیع اور گہرے مطالعے کی روشنی میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ انقلابات عقائد و نظریات، اقدار و توازن اور نظم و نسق اور در پیش مسائل و حالات کے لیے اپنی ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور بلاشبہ ان کی تکمیل صرف ۲۳ سال میں ہوئی ہے لیکن انہوں نے کسی خرقِ عادت معجزے سے اپنے تکمیلی مراحل نہیں طے کیے ہیں بلکہ ایک فطری نبوی طریقۂ تربیت کے سہارے مکمل ہوئے ہیں۔

یہ کتاب ان بے شمار حالات کی بھی منظر کشی کرتی ہے جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مادی مفادات اور نسلی عصبیّات میں گھرنے کے باوجود ایک حکیم مربی کی طرح ثابت قدم رہے۔ آخر کار ان تمام حالات پر آپؐ کو فتح و نصرت حاصل ہوئی اور آپؐ نے ان حالات کے رُخ کو موڑا۔ اور پھر نئے تصورات و خیالات اور نئے سرے سے ایک نظام قائم کیا۔

مؤلف نے ان باتوں کو مدلّل کرنے کے لیے بہت سی واضح عبارتیں اور دلیلیں پیش کی ہیں جس کے بعد پھر اس کا امکان کہاں رہ جاتا ہے کہ حدیث ان انقلابات کا عکس واثر اور نتیجہ ہے جن کا مشاہدہ اسلامی معاشرے نے ابتدائی دو صدیوں میں کیا ہے۔

مؤلف نے اس مکروفریب اور باطل دعوے کو ناقابلِ اعتناء سمجھا، نہ کھُل کر اس کی وضاحت کی ہے اور نہ اشارہ فرمایا ہے بلکہ قارئین کرام کو آپؐ کی سنّت مطہرہ کی عطر بیز فضا میں چھوڑ دیا ہے کہ سنّت مطہرہ کے روشن و تابناک پہلو کی وضاحت ہو جانے کے بعد وہ از خود ان نام نہاد دعووں کو غلط ثابت کردیں۔ کتاب کے ان مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے "مرکز خیری" نے اس کتاب کی نشر واشاعت کی ذمہ داری کو اپنے دائرۂ اختیار میں لے لینا مناسب سمجھا۔

اللہ تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور مسلمانوں کو اپنی موجودہ زندگی کی اس فتنہ انگیز گھڑی میں اس سے استفادے کی توفیق عطا فرمائے، اسی طرح اپنے ہم وطن بانیین اور ارکان اور جامعۃ الامام کے جملہ افراد بالخصوص ان کے سربراہ جامعۃ الامام کے ڈائرکٹر اور "مرکز" کی مجلس انتظامیہ کے صدر عزت مآب جناب ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن ترکی کے لیے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کرتا ہوں کہ ان افراد کو ہر کار خیر کی توفیق عطا فرمائے، اور دنیا و

آخرت دونوں جہاں میں اس کی برکات سے بہرہ ور فرمائے۔ انہ سمیع مجیب۔

آخر میں اللہ رب العزت کی حمد و ثنا کے بعد یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جملہ اصحاب اور سارے انبیاء کرام پر اپنی رحمت و سلامتی نازل فرمائے۔ آمین۔

عبدالعزیز محمد السہیل،
مدیر مرکز خیری تعلیم القرآن وعلوم،
ریاض۔

تقدیم

ڈاکٹر لقمان اعظمی ندوی

یہ چمنستانِ احادیث نبویہ کے مہکتے چند پھولوں کا حسین گلدستہ ہے جس میں تیس ۳۰ احادیث مبارکہ شامل ہیں ان میں کچھ تو وہ ہیں جو سنّت کی اساس ہیں اور کچھ وہ ہیں جنہیں اخلاق و اقدار اور سیرت و کردار کا ستون قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور بعض کے اندر معاشرتی بیماریوں کا علاج بتایا گیا ہے، جیسے رشوت، جھوٹی گواہی اور سودی لین دین وغیرہ۔

یہ منتخب نصوص اتنے طاقت ور اور جان دار ہیں جن سے حضرات صحابۂ کرام مدرسۂ نبوت میں روزانہ نئے نئے سبق حاصل کر رہے تھے اور قوم مسلم کے طرزِ معاشرت اور اس کے گردوپیش جو نئے نئے حالات اور نئی نئی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں ان سب کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے، جس میں نہاں خانۂ دل میں پوشیدہ اسرار و رموز سے لے کر افکار و خیالات تک شامل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔ فمن کانت هجرته لدنیا یصیبها أو امرأة ینکحها فهجرته الی ما هاجر الیه۔ جس نے دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے شادی کرنے کی غرض سے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کی جانب ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔

اور انہیں افکار و خیالات کے پسِ پردہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ گراں قدر تشریحات و توضیحات بھی سامنے آجاتی ہیں جو بنی نوعِ انسانی کی

رہنمائی کرتی ہیں اور ان کی بیماریوں کا علاج بتاتی ہیں۔ ارشاد نبوی ہے۔ انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ ما نوی۔ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے۔ ان احادیث کا مرکزی نکتہ اسلام کے اعتقادی تصور کی تعمیر ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔ بُنی الاسلام علیٰ خمسٍ۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ نیز اس اعتقادی تصور کو توضیح و تشریح اور بُت پرستی کی من گھڑت داستانوں سے پاک و صاف بھی کرنا ہے۔ فرمانِ رسول ہے۔ من أحدث فی امرنا ھذا مالیس منه فھورد۔ جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کی جو اس میں نہیں ہے تو اس کی وہ شہادت قابلِ رد ہے۔ ان احادیث کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ قوم مسلم کو اس کے حقیقی کردار سے آگاہ کیا جائے۔ رسول اللہ علیہ الصلاۃ والسلام ارشاد فرماتے ہیں أمرت أن اقاتل النّاس حتی یشھدوا أن لا الٰہ إلا اللہ وأن محمدا رسول اللہ۔ مجھے لوگوں سے اس وقت تک جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ اس بات کا اقرار نہ کریں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، اور ساتھ ساتھ قوم مسلم کو اس کی شخصیت، اس کی حقیقت اور جس راہ کے وہ راہی ہیں اس کے مزاج اور حالات اور پیش آنے والے خطرات کی خارزار وادیوں سے روشناس کرایا جائے اور ان مقامات کی نشان دہی کی جائے جہاں قدم ڈگمگانے کا خدشہ ہے اور اس میں جو کچھ ابتلا و آزمائش پیش آسکتی ہے اس سے آگاہ کیا جائے۔ حدیث میں ہے، قل أمنت باللہ ثم استقم۔ آپ کہہ دیجیے میں ایمان لے آیا، پھر سیدھی راہ پر گامزن ہو جائیے۔ ان احادیث کی جامع و مانع اور ہمہ گیر مطالعہ و تحقیق اور بحث و نظر یعنی تخریج اور لغوی فقہی، ترتیبی تحلیل و تجزیے سے مدینہ منورہ کی زندگی اور وہاں کے عادات و رسوم میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں، اور نئے اقدام و بلند افکار کی تخلیق کا واضح نقشہ اُبھر کر ہمارے سامنے آجاتا ہے اسی طرح اُبھرتے ہوئے

اسلامی معاشرے کا پورا پیکر اپنے پورے خدوخال کے ساتھ انسان کے داخلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہوا بالکل نگاہوں کے سامنے مرتسم ہو جاتا ہے اور اسی طرح وہ تربیتی اسلوب جس نے قلب ونظر کی تطہیر اور انسانی زندگی کو عروج وارتقاء کی شاہ راہ پر گامزن کرنے میں کلیدی رول ادا کیا، پوری طرح روشنی میں آجائے گا۔ ایک ایسا تربیتی اسلوب جس نے ان نئے اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی نظریات کی ایجاد میں حصّہ لیا جو ایسے عقیدے کی دین ہیں جو کائنات اور زندگی اور انسان کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اور تحدید کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ تربیت نے ان احادیث کے توسط سے جو اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تطبیق کے لیے آئی ہیں۔ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس۔ اور ہم نے تمہاری جانب اپنا کلام اُتارا تاکہ تم اُسے لوگوں سے صاف صاف بیان کرو۔ آپؐ نے اپنے ربانی طرزِ تربیت سے عربوں کی شخصیت میں ان طاقت ور اور اُبلتے جذبات کو پیوست کر دیا اور انہیں اِن اخلاقِ کریمانہ کا خوگر بنا دیا حالاں کہ عرب اس سے قبل اس سے بہت ہی دُور تھے۔

عربوں کا قدیم جاہلی دستور تھا أنصر اخاك ظالما او مظلوما۔ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم اور جاہلی حمیت وعصبیت کا نعرہ اور ظلم وتعدی وفسق وفجور پر تعاون کرنا نیکی اور تقویٰ پر تعاون کرنے سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ تھا اور جَور وزیادتی بالکل ان کی گھٹی میں پلا دی گئی تھی۔

جاہلی شاعر کہتا ہے:

والظلم من شِیم النفوس فان تجد ذا عِفۃٍ فلعلۃ لا یظلم

اور ظلم انسانی فطرت میں داخل ہے اگر تم کسی کو ظلم کرنے سے بچنے والا پاؤ تو سمجھ لو کہ وہ کسی مجبوری کی وجہ سے ظلم نہیں کر رہا ہے۔

۴۔ ڈرا دھمکا کر پڑھانے کا اسلوب ۔ ایاکم والکذب ۔ تم جھوٹ سے بچو۔
۵۔ شوق دلانے اور متوجہ کرنے کے ذرائع واسالیب ۔ اُلا ۔ خبردار ۔
۶۔ پہلو بدل بدل کر ایسے طریقے استعمال کرنا جس سے مخاطب ہمہ تن گوش ہو جائے مثلاً وَکان متکئا فجلس ۔ آپ ٹیک لیے ہوئے تھے پھر اچانک بیٹھ گئے۔

یہ کتاب دراصل ان چند محاضرات کا مجموعہ ہے جنھیں میں نے حائل کے ٹریننگ کالج میں اسلامی دراسات کے شعبے کے طلبہ کے سامنے دیا تھا۔ ٹریننگ کالج کے انتظامیہ کے ذمہ داروں نے احادیث کے انتخاب اور نصاب کی تعیین میں پہل کرنے کا شرف حاصل کیا جو اس سلسلے میں ہر طرح کے شکر اور قدر شناسی کے مستحق ہیں ۔ یہ ایک تربیتی وحقیقت پسندانہ نصاب ہے جو قاری کو علم حدیث سے مانوس اور اس کا شائق بناتا ہے اور حدیث کو فقہ سے ہم آہنگ کرنے اور طالب علم کے اندر شرعی احکام کو کتاب وسنت کے ساتھ مربوط کرنے کی مشق و مزاولت کی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے اور محقق کو حدیث پاک میں موجود احکام اور حکمتوں وبلاغتوں کا ادراک کرنے میں تعاون ملتا ہے ۔ مگر یہ نصابِ تعلیم اس بات کا بھی متقاضی تھا کہ احادیث کی لغوی اعتبار سے جانچ پڑتال کی جائے ، اس لیے ہم نے اعراب کی بنیادی باتوں کو ذکر کر دیا ہے ۔ نیز اس کے اندر الفاظ کی دلالتوں پر توجہ دینے اور بلاغت کے اسالیب سے مدد لینے کی بھی ضرورت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس کے ذریعہ اس قوی اور پرزور دلالت تک رسائی ہو سکے جو عمومی معنی کی وضاحت کرے اور فکر کو روشن کرے اور کلمات نبوت کے اسرار سے پردہ ہٹانے اور قاری کے جذبات کو اُبھارنے اور جگانے میں ممد ومعاون ہو جس سے اس کے اندر اسلام کی روح بیدار ہو جائے ۔

احادیث کی تحقیق مندرجہ ذیل طریقے پر ہے

• احادیث کی تحقیق و تطبیق اس طرح سے ہوتی ہے کہ اس کو عملی جامہ پہنا کر نصب العین تک پہنچایا جا سکے۔

• اور سنت کی اہمیت اور قانون سازی کے میدان میں اس کے مقام و مرتبہ کی وضاحت کی جائے۔

• فردِ مسلم کو تیار کرنے اور اس کی تربیت میں معاون ہو تاکہ وہ صالح معاشرے کی تعمیر میں ایک صالح اور کارآمد اینٹ قرار پا سکے۔

• ان احادیث کی ترتیب ایسی ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا سراپا نگاہوں کے سامنے آجائے تاکہ قاری کے دل میں آپؐ کی محبت اور آپؐ سے لگاؤ وشیفتگی اور آپؐ کی سیرت سے والہانہ تعلق پیدا ہو۔

• نیز اسے مشہور مستشرق "جولد تسیہر" کا دنداں شکن، علمی رد قرار دیا جا سکے جسے تمام مستشرقین فن کا سب سے زیادہ واقف کار کہتے ہیں۔ یہ مستشرق احادیث نبویہ کے بیشتر حصے کو قرنِ اول اور قرنِ ثانی میں ہونے والے اسلام کے دینی، تاریخی اور اجتماعی ارتقاء کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور اپنے دعوے کو ٹھوس مثالوں اور دلیلوں سے ثابت کرنے کا زعم رکھتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ احادیث کس طرح اپنی عصری رُوح کی ترجمانی کرتی ہیں۔

ہماری یہ کاوش ایک قلیل البضاعت کی حقیر سی کوشش ہے میرے خیال میں میں نے اس کے اندر کوئی نئی چیز نہیں پیش کی ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں نے صرف بعض اقوال کی تلخیص اور اس کے جمع و ترتیب اور باہم مربوط کرنے کا کام کیا ہے تاکہ وہ نصاب کے ساتھ فٹ ہو سکیں اس سلسلے میں میں نے ان مفکرین کے افکار اور داعیوں کے اسالیب سے کافی فائدہ

اُٹھایا ہے جنہوں نے اس دین اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کو زندہ کرنے کے لیے اپنی جان قربان کی اور اپنی نذر کو پورا کر دکھایا۔

میں انہیں کے سائے تلے چلتا رہا اور انہیں کے نقشِ قدم کی پیروی کرتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ توفیق دی کہ تعلیم کے قصرِ بلند میں ایک اینٹ چُنوں اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کچھ سعادت حاصل کرسکوں اگر میں اس ذمہ داری کو نباہ سکا ہوں تو یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔

اور اگر بلا قصد وارادہ جادۂ مستقیم سے ہٹا ہوں تو مجھے اپنے رب سے اُمّید ہے کہ وہ مجھے اپنے دامنِ عفو وکرم میں جگہ مرحمت فرمائے گا اور مجھے مجتہدینِ کرام کے اجر وثواب سے محروم نہ رکھے گا، میری اس کدّو کاوش کو ایسا علم قرار دے گا جس سے قیامت تک فائدہ اُٹھایا جاتا رہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں اور وہ کیا ہی بہتر آقا اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔

اور آخر میں میں ان تمام حضرات کا تہِ دل سے ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کو منظرِ عام پر لانے میں میرا تعاون کیا خصوصًا میں انجینئر محمد سلیم عبداللہ کا شکرگزار ہوں جنہوں نے نہایت ہی گراں قدر برادرانہ تعاون دیا کیوں کہ تعلیمی سال میں رہ کر کتاب کی تبییض اور آیات کی تخریج میں تعاون کیا اور انہوں نے اس کے اجر وثواب کی صرف اللہ تعالیٰ ہی سے امید رکھی۔ اور اللہ ہی کے پاس بہترین اجر ہے۔

تقدیمِ ثانی

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خاتم الانبیاء والمرسلین محمد بن عبد اللہ الذی اُوتی القرآن ومثلہ معہ وجعل اللہ محبتہ فی اتباعہ۔

(آپ کے ہاتھوں میں اس وقت ان منتخب احادیث کا مجموعہ ہے جو اسلامی عقیدے اور معاشرے کی دل کش تصویر پیش کرتی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور آپ کے اسوۂ مبارکہ پر عمل ہی ربّ کائنات سے محبت اور اس کی اطاعت کی دلیل ہے ارشاد فرمایا، اپنے پیارے نبی کی زبان سے کہلوایا"۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم ۔ (اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

(آل عمران: ۳۱)

اللہ سے محبت محض زبانی دعوی کا نام نہیں بلکہ اس ذات عالی سے محبت حقیقی وہ ہے جو دل میں سما جائے اور انسان کی ہر ہر حرکت و سکون میں اس کی محبت کی جلوہ گری نظر آئے شاعر کی زبان میں:

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل جس طرح بادِ سحر گاہی کا نسیم

اور محبت کی یہ چنگاری شعلہ اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے

ایک ایک قول و عمل اور آپ کے ہر نقشِ قدم کی پوری اتباع نہ ہو اور زندگی کے میدان میں آپ ہی کے طریقۂ حیات کو جاری و ساری نہ کیا جائے بقول اقبال:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
گر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

(اپنے کو محمد عربیؐ کے نقوش پر لے چلو کہ آپ کے نقوشِ راہ ہی دین ہیں اگر ان تک نہیں پہنچے تو اس کے سوا جو کچھ ہے، سب ابولہب کا طریقہ ہے)۔

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں جن کو محض زبان سے دہرایا جائے اور جذبات و احساسات میں کوئی طوفان نہ برپا ہو اور شوقِ طاعت و سرافگندی سے سرشار ہو کر ہر بُن مو سے یہ صدا نہ آنے لگے:

فرصت کش مکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوے تابدار را

محبتِ خداوندی ایک روشن حقیقت بن جائے جس میں قانونِ شریعت کی پابندی اور اتباعِ رسولؐ کی شمیم جاں فزا کی عطر بیزی پائی جاتی ہو، اپنے ہر کام میں اللہ کی کتاب ہی کو اپنا حکم و قاضی بنایا جاتا ہو جس کی وضاحت و تشریح زبان نبوتؐ نے کی ہو، فرمایا:

إنا أنزلنا إليك الذكر لتبين للناس ما نزل اليهم ولعلهم يتفكرون۔

اللہ کے رسولؐ اس ذکر (قرآن کریم) کی شرح و تفصیل بیان فرماتے رہے اور تھوڑے دن نہیں اور صرف زبان سے بھی نہیں، بلکہ گفتار و کردار، نشست و برخاست، زندگی کے شب و روز اور چال ڈھال سب میں قرآن کی تفصیل و تشریح ہی جھلکتی رہی حتی کہ آپ کی سیرت کا عطر و خلاصہ اس ایک لفظ سے ادا کیا گیا "کان خلقه القرآن" آپؐ کا دستورِ حیات تو قرآن پاک تھا کہ ہر ادا اسی کے رنگ و آہنگ میں ڈوبی ہوئی تھی، اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ آپؐ کی تربیت و سیرت

سازی خود دستِ قدرت نے فرمائی تھی، آپؐ نے خود فرمایا، أدبنی ربّی فأحسن تادیبی۔

'میری تربیت میرے مالک و آقا نے کی ہے' اور ایسی کی جس کو نقشِ دوام حاصل ہو، جو رہتی دنیا تک کے انسانوں کے لیے اسوۂ کامل اور منارۂ نور ثابت ہو، چناں چہ مربّی و آقا خود اس کا اعلان فرماتا ہے اور سارے انسانوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے:

"لقد کان لکم فی رسُول اللّٰہ أسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللّٰہ والیوم الأخر" (الاحزاب - ۲۱)

درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا اُمیدوار ہو۔

آج کے بگڑے ہوئے ماحول اور الحادو بے دینی کے چلتے ہوئے جھگڑوں میں امت مسلمہ کے لیے کتنا ضروری ہے کہ وہ اسوۂ رسولؐ کو اپنائے اور آپ ہی کے نقوش حیات کو حرزِجاں بنائے کہ اس کے بغیر زندگی کے منجدھار میں پھنسی ہوئی ڈانوا ڈول اس کی کشتی ساحل سے ہم کنار نہیں ہوسکتی۔

ایسے ہی ہمارے مدارس و جامعات کو بھی اس کی کتنی شدید ضرورت ہے کہ وہ اپنے طلبہ اور طالبات کو سیرت و کردار کے اس سانچے میں ڈھالیں جو اللہ کے رسولؐ نے بتایا اور اس کو برت کر دکھایا ہے اور بگڑی اور سڑی گلی انسانیت کے داغ دھبوں کو دھوکر اس کو چمکایا اور مہکایا ہے۔

سعودی وزارتِ تعلیم کو اس ضرورت وحقیقت کا احساس ہوا تو اپنے ٹریننگ کالجوں میں علم حدیث کے پڑھانے کی طرف توجہ دی اور اس کے لیے احادیث کے انتخاب کا داعیہ پیدا ہوا اور اس کو عملی جامہ پہنایا گیا، اسی کے ساتھ مناسب اور بہتر انداز پر اس کے پڑھانے کا بھی طریقہ اختیار کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ اس نے اس مبارک فن کو پڑھانے کی سعادت سے مجھے نوازا جو اس ضابطے کے مطابق تھا جو ٹریننگ اور ڈگری کالجوں کے لیے حکومت کی طرف سے طے کیا گیا تھا، یہ کتاب جو "تدبرِ حدیث" کے نام سے آپ کے ہاتھ میں ہے، سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رواج دینے، اس مبارک علم کی خدمت کی سعادت اور نوجوانوں کے شوق و رغبت کی تکمیل بلکہ علم حدیث سے ان کے شوق و شغف اور پیاس کو بڑھانے کے لیے لکھی گئی ہے۔ جو اصلاً ٹریننگ کالج کے طلبہ کے لیے مرتب ہوئی تھی، اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں اس کی افادیت کو بڑھانے کے لیے پہلے ایڈیشن کی بعض حدیثوں کے حذف اور دیگر حدیثوں کے اضافے سے کام لیا گیا۔

جس میں "الحلال بیّنٌ والحرام بیّنٌ" کا اضافہ بھی شامل ہے جس کی عظمتِ شان پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہ حدیث ان اہم حدیثوں میں سے ایک ہے جس پر اسلام کا مدار ہے، علماء کی ایک جماعت کا تو یہ کہنا ہے کہ اس حدیث میں اسلام کا ایک تہائی حصّہ آگیا ہے، اسلام کا محور یہ حدیث اور "إنما الأعمال بالنیات" اور "مِن حُسنِ إسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ" ہے۔

امام ابوداؤدؒ نے فرمایا اسلام کا محور چار حدیثیں ہیں، تین حدیثیں تو وہ جن کا اوپر تذکرہ ہوا اور چوتھی حدیث "لا یؤمن أحدکم حتی یحب لأخیہ ما یحب لنفسہ"۔ اور اسی اضافے میں حدیث "الدین النصیحۃ" اور "احفظ اللہ یحفظک" "ومن رأی منکم منکرا" "الطھور شطر الایمان" وغیرہ ہیں۔

ان منتخب احادیث کے مطالعے میں قاری کو ایمان کا لطف و چاشنی اور بیان و دعوت کا جلال و جمال نظر آئے گا اور محبت رسولؐ کے شوق و جذبے کو حرکت میں لانے والی تاثیر ملے گی۔ اور اسی کے ساتھ آپؐ کی اتباع کا کھلا ہوا وسیع میدان ملے گا جس کو قرآن کریم کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفرلکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم
تو میری پیروی کرو خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اخیر میں ان احباب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے حدیث پاک کے اس خوب صورت اور حسین گل دستے کو تیار کرنے کے بعد کتابی شکل میں لانے کے مراحل میں حصّہ لیا اور ان کے پیش نظر صرف رضائے خداوندی رہی اس کا صلہ اور بدلہ آخرت پر رکھا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان احباب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور نیک توفیقات سے نوازتا رہے۔

بالخصوص جناب صالح سمر کا مشکور ہوں جنھوں نے کتاب کی طباعت اور پریس کی غلطیوں کو درست کرنے کا فرض انجام دیا تھا۔ دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں میں اپنے دوست مولانا شمس الحق صاحب ندوی ایڈیٹر تعمیر حیات کا جنھوں نے سلیس اور دل کش اسلوب میں کتاب کو اُردو میں منتقل کیا، جن کے علم و عمل اور اخلاق سے میں متاثر تھا اور خواہش تھی کہ اس گلدستۂ نبوت کا ترجمہ کوئی سنّت کا پابند اور عشق رسول کا شیدا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے میری یہ خواہش پوری کی اور مولانا نے اپنی غیر معمولی مشغولیات اور متعدد ذمہ داریوں کے باوجود اس کام کو بہ خوبی انجام دیا، اللہ تعالیٰ ان کو اس کا بہترین صلہ عطا فرمائے اور حضورؐ کے اس قول "إن احبکم إلیّ أحاسنکم أخلاقاً" کا انہیں نمونہ بنائے۔ آمین

۱

عمل کی قبولیت کا انحصار نیّت پر ہے

عَنْ أَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ أَبِيْ حفص عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: سمعت رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يقول: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَىٰ فمن كانت هِجْرَتُه إِلَى اللهِ وَرَسُوْلِه فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُوْلِه وَمن كانت هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوْ إِمْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُه إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ۔ (متفق علیہ)

حضرت عمر بن الخطّاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا، آپؐ فرماتے تھے کہ "تمام انسانی اعمال کا دار و مدار بس نیتوں پر ہے اور آدمی کو اس کی نیت ہی کے مطابق پھل ملتا ہے، جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کی اور خدا و رسول کی رضا جوئی و اطاعت کے سوا اس کی ہجرت کا اور کوئی مقصد نہ تھا تو اس کی ہجرت درحقیقت اللہ اور رسولؐ کی طرف ہوئی — اور بے شک وہ اللہ کا سچا مہاجر ہے، اور اس کو ہجرت الی اللہ و الرسول کا مقررہ اجر ملے گا — اور جس نے کسی دنیوی غرض کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کی خاطر ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ و رسول کے لیے نہ ہوگی، بلکہ فی الواقع جس دوسری غرض اور نیت سے اس نے "ہجرت" اختیار کی ہے، عند اللہ اس کی ہجرت اسی کی طرف مانی جائے گی۔

یہ حدیث بندۂ مومن کے سامنے وہ میزانِ عدل پیش کرتی ہے جس سے یہ بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ مسلمان کو ہر عمل میں کس بات کا خیال و لحاظ رکھنا ضروری ہے اس لیے کہ انسانی اعمال کا مقصودِ اصلی تو یہی ہے کہ قصد و ارادہ درست و نیک ہو، جب نیت صحیح ہوگی اور دل میں خلوص ہوگا جبھی بندۂ مومن اجر کا مستحق ہوگا — حاصلِ کلام یہ کہ انسان کے عمل کا اس کے مقصد و ارادے سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

اسی لیے یہ حدیث ہر عمل سے پہلے سے نیت اور ارادے کو درست کرنے اور رضائے خداوندی کو مقدم رکھنے پر پورا زور دیتی ہے، اس لیے کہ آدمی کو ثواب اچھی نیت اور ارادہ کرلینے ہی سے مل جاتا ہے، گو وہ کسی رکاوٹ کی وجہ سے اپنی نیت اور ارادے کو عملی شکل نہ دے سکے — نیت کی اہمیت کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ اس حدیث میں عمل قبول ہونے یا نہ ہونے کا سارا دارومدار نیت ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ بعض کام ایسے ہیں کہ نیت کے بغیر بھی درست اور صحیح ہوتے ہیں۔ مثلاً کپڑے کا بغیر نیت کے نجاست سے پاک و صاف کرلینا۔ لیکن نیت کے ثواب سے محروم رہے گا اس لیے کہ حدیث میں یہ بھی صراحت ہے کہ ہر آدمی کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہے۔ اب اگر کسی نے بلا نیت کے اپنے کپڑے نجاست سے پاک کرلیے تو کپڑے تو پاک ہوگئے، لیکن کپڑے پاک کرتے وقت یہ نیت کہ میں نماز پڑھنے یا تلاوت کرنے کے قابل ہوجاؤں یا یہ کہ ایک مسلمان کو ناپاک نہیں رہنا چاہیے' اس نیت کا جو ثواب ملتا اس سے یہ محروم رہا۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ مسلمان کو اپنی نیت کا صحیح کرنا اور ہر کام کو صرف اللہ کی رضا کے لیے کرنا ضروری ہے اس لیے کہ اس کے بغیر مسلمان جو کچھ کرے گا اس کے اجر و ثواب کا نہ حق دار ہوگا اور نہ اسے اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہی حاصل ہوگی۔

دیکھنے میں دو آدمی ایک ہی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ دونوں کے کام میں ظاہری طور پر کوئی فرق نہیں نظر آتا، مگر نیت اور ارادے میں فرق پایا جاتا ہے۔ ان میں

ہے ایک کی نیت اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے جب کہ دوسرا اس عمل کے ذریعے کوئی مادّی فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مدرسے میں دو طالب علم پڑھ رہے ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کی غرض سے پڑھ رہا ہے اور دوسرا اس علم کے ذریعے مادّی فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ ان دونوں طالب علموں کی مثال ہجرت کرنے والے ان دو آدمیوں کی سی ہے کہ ایک نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی خاطر گھر بار چھوڑا اور دوسرے نے کسی دنیوی نفع کے لیے، طبرانی نے "المعجم الکبیر" میں ام قیس سے شادی کرنے کی غرض سے ہجرت کرنے والے شخص کا قصہ نقل کیا ہے، اس قصے کو بیان کرنے والے سبھی لوگ قابلِ اعتماد اور ثقہ ہیں۔ ابو وائل حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے بیان فرمایا: ہم لوگوں میں ایک شخص تھا اُس نے "ام قیس" نامی ایک عورت سے شادی کا پیغام دیا، اس نے کہا کہ اگر تم ہجرت کر کے ہمارے یہاں آجاؤ تب شادی کروں گی ورنہ نہیں چنانچہ اس شخص نے اس عورت سے شادی کی خاطر وطن چھوڑا اور ہجرت کی اس لیے ہم لوگ اس شخص کو "مہاجرِ اُم قیس" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔

مکہ مکرمہ میں صحابۂ کرام کی آزمایش وامتحان کفّار کی ایذا رسانی، طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانا، ستانا اور ہنسی مذاق اُڑانا تھا، پھر جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو ہجرت کی اجازت دے دی تو یہ امتحان گھر بار مال وجائداد اور وطنِ عزیز کو چھوڑ دینے کی صورت میں پیش آیا، وہ حضرات امتحان کی پہلی اور دوسری دونوں صورتوں میں اپنے دین میں پکّے اور رضائے الٰہی کے طالب ہونے میں ثابت قدم اور مخلص رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو زبردست تربیت حاصل کی تھی اور مکہ مکرمہ میں نازل ہونے والی آیات نے ان کے دلوں میں توحید کا جو پودا لگایا تھا ان دونوں چیزوں کا ان پر گہرا اثر تھا۔ یہ حدیث اسی کو مزید پختہ کرنے کے لیے وارد ہوئی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور تنہا اسی کو خالق ومالک جاننا اور دین کے بارے میں مخلص ہونا ہی وہ بنیاد ہے جس پر

زندگی کے سارے مسائل و معاملات کی عمارت قائم ہوتی ہے۔

دعوت و تبلیغ کی راہ میں ہجرت ایک نازک اور اہم موڑ تھی، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا کہ ہجرت میں کسی دنیوی اور مادی نفع کا کوئی شائبہ نہ ہونا چاہیے، ہجرت محض رضائے الٰہی اور صرف دین و ایمان ہی کے جذبے سے ہونی چاہیے۔ دل کو دوسری خواہشوں سے قطعی پاک ہونا چاہیے اس لیے کہ دل ہی وہ ظرف ہے جس میں توحید کا سودا سماتا ہے اور وہیں سے اس کا چشمہ اُبلتا ہے اور اسی کی طاقت سے بندۂ مومن اپنے تمام معاملات میں صرف خدائے بزرگ و برتر ہی پر بھروسا کرتا ہے اور اس کا ہر ہر عمل اسی کی رضا جوئی کے لیے ہوتا ہے، اس کے تصور و خیال، نیت و ارادہ اور حرکت و عمل غرض کہ ہر بات میں توحید ہی کا اثر جلوہ گر ہوتا ہے۔ خلوص نیت ہی پوری زندگی کے لیے ایک مکمل و ممتاز لائحۂ عمل بخشتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہجرت ہی وہ سب سے اہم اور بڑا کام ہے؛ جس میں دلوں کا امتحان ہوتا ہے اگر نیت درست اور خلوص سے لبریز ہے تب تو یہ اسلامی ہجرت کہلائے گی ورنہ نہیں۔ اس لیے کہ ہجرت مال و دولت، مصائب سے امن و عافیت، نفسانی لذّتوں اور خواہشوں کی تکمیل یا کسی اور دنیوی فائدے کے لیے نہیں ہوتی، وہ تو صرف اللہ کی خوشنودی اور اس کی راہ میں دُکھ اور تکلیف جھیلنے کے لیے ہوتی ہے۔

جو شخص کسی دُنیوی غرض یا کسی عورت سے شادی کرنے کی خاطر ہجرت کرے گا تو یہ اس کی اندرونی کمزوری اور اس حرص و طمع کی علامت ہوگی جو یہ تصوّر پیدا کرتی ہے کہ زندگی کے وسائل اور رزق، کسی خاص خطّہ زمین ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں، وہ کچھ ایسے ذرائع سے جُڑے ہوئے ہیں کہ اگر ان کو چھوڑ دیا جائے تو زندگی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ رزق کے اسباب و وسائل اور زندگی کی بقا و نجات کے بارے میں یہ بالکل غلط گمان ہے اور یہ نفسانی خواہشوں اور لذتوں

کو پورا کرنے کی غلط راہ ہے، حدیثِ بالا میں اسی مرض کا علاج بتایا گیا ہے تاکہ زندگی کے قافلے میں مومن کے ہر عمل اور ہر ہر نقل و حرکت میں اس کے تصورات و احساسات میں توحید و اخلاصِ نیت ہی کی جلوہ گری ہو۔

اس حدیث سے دل کے وساوس کا علاج کھل کر اس طرح سامنے آجاتا ہے کہ کوئی شک و ابہام نہیں باقی رہ جاتا۔

حدیث کا فقہی پہلو

فقہاء کا کہنا ہے کہ تمام اعمال کے اندر نیت کے واجب ہونے کی مختلف صورتیں ہیں۔

۱۔ ائمہ کرام نے از قسم عبادات تمام اعمال کے اندر نیّت کو واجب کہا ہے مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، وضو وغیرہ جس میں عام طور پر عملاً نیت مطلوب ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک حدیث کے الفاظ گویا اس طرح ہیں: صحة الاعمال بالنیات یعنی عمل کے صحیح ہونے کا انحصار نیت پر ہے۔ اعمال کا "ال" استغراق کے لیے ہے یعنی تمام اعمال، جیسا کہ طلاق اور آزاد کرنا وغیرہ، اس لیے کہ اگر کنایہ میں بھی نیت پائی جائے گی تو وہ کنایہ صراحت کے درجے میں ہوگا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث شریف میں لفظ اعمال کے بعد "تُحسَبُ" مقدر ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اعمال پر ثواب اسی وقت ملے گا جب نیت پائی جائے گی، اگر نیت نہ پائی گئی تو ثواب نہیں ملے گا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ طہارت اور دوسری تمام عبادتیں نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوسکتیں۔

خطابی کا کہنا ہے کہ حدیث میں اعمال سے مُراد عینِ عمل نہیں ہے اس لیے کہ وہ حسّی طور پر مشاہدے میں آرہا ہے نیت ہو یا نہ ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کے معاملے میں اعمال کے احکام کا صحیح ہونا نیت پر منحصر ہے کہ نیت ہی سے صحیح

ہونے یا نہ ہونے کا فرق کیا جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ وسائل مثلاً وضو اور غسل، ان میں نیت کا پایا جانا ضروری نہیں۔ امام غزالیؒ نے نیت کے بارے میں عمل کے محرک کا اعتبار کیا ہے یعنی اگر عمل پر دنیوی محرکات غالب ہیں تو اس عمل پر اجر نہ ملے گا اور دینی محرکات غالب ہیں تو اجر ان محرکات کے بقدر ہوگا اور اگر دنیوی اور دینی دونوں محرکات برابر ہیں تو کچھ بھی نہ ملے گا۔

تیمیؒ فرماتے ہیں کہ نیت کا درجہ عمل سے بھی بڑھ کر ہے کہ اچھے کام کی نیت کر لینے کے بعد اگر وہ کام نہ بھی ہو سکے تو نیت کا ثواب مل جاتا ہے اس کے برعکس اگر کوئی اچھا کام کرے اور نیت نہ ہو تو اس عمل پر کوئی اجر نہ ملے گا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ آپؐ نے فرمایا ہے "جس نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور اس کو کر نہ سکا تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دی جائے گی اور اگر کر لیا تو دس نیکیاں لکھی جائیں گی" آپؐ سے یہ بھی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے" پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نیت کا درجہ عمل سے کم ہے اور دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نیت عمل سے بھی بڑھ کر ہے۔

"ہجرت ہر اس شخص پر واجب ہے جو کسی ایسی جگہ رہتا ہو جہاں کفر، گمراہی اور بدعات کا غلبہ ہونے کے سبب اپنے دین کے اظہار سے عاجز اور بے بس ہو اس کو واجبات کے ادا کرنے سے روکا جاتا ہو، اس لیے کہ جس چیز کے بغیر واجب ادا نہ کیا جا سکتا ہو اس کا کرنا بھی واجب ہے۔ اگر وہ اپنے دین کے اظہار پر قدرت نہیں رکھتا ہے تو پھر ہجرت مسنون ہے۔" یعنی اس کے لیے ہجرت مستحب ہے تاکہ مسلمانوں کی تعداد کو بڑھانے اور جہاد کی صلاحیت پیدا کرنے پر قادر ہو سکے۔

موجودہ حالات اور حدیث

انسان بہرحال انسان ہے، بھول چوک اور نفس کی کمزوری اس کے خمیر میں داخل

ہے، لہٰذا وہ کبھی کبھی اچھے ماحول اور معاشرے میں رہتے ہوئے بھی لذّتوں کے سامنے ڈگمگا جاتا ہے، مشکلات اور دشواریوں کے سامنے سست اور کمزور پڑ جاتا ہے، اس صورت میں ایسے نفوس کی اصلاح و تربیت سے مایوس ہو جانا مناسب نہیں بلکہ ان کو عمل پر آمادہ کرنا، ہمّت بڑھانا، ڈرانا اور ان کی نیت کو دنیوی اغراض سے پاک کرنا، یہ اس کا علاج ہے۔ ہم میں سے کون یہ تصوّر کر سکتا تھا کہ عہد نبوی کا مسلمان کسی دنیوی فائدے کی غرض سے ہجرت کرے گا۔

لیکن اس حدیث نے اچھی طرح واضح کر دیا کہ شیطان کن کن راہوں سے بندۂ مومن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ قرطبی نے ابن عربی سے روایت کیا ہے کہ "عہد رسالتؐ میں ہجرت فرض تھی۔ یہ فرض قیامت تک کے لیے باقی ہے۔" فتح مکہ کے بعد جو چیز ختم ہوئی ہے جیسا کہ آپؐ نے فرمایا "فتحِ مکہ کے بعد ہجرت نہیں" اس سے مراد حضورؐ کے پاس مکہ سے ہجرت کر کے جانا ہے جس کی فتح مکہ کے بعد ضرورت نہ رہی۔ اس معاملے میں دار الحرب ہر وہ جگہ ہے جہاں مسلمان دینی شعائر نماز، روزہ، جماعت اور اذان وغیرہ اسلام کے ظاہری احکام کو نہ قائم کر سکتا ہو۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ طالبِ علم کے لیے ضروری ہے کہ اپنی نیت کی تصحیح کرے اور اپنے عمل اور پڑھنے لکھنے کو عبادت، قربِ خداوندی اور مسلمانوں کی بہتری اور نفع کے لیے خالص کرے؛ نہ کہ دنیا اور مادّی فوائد کے لیے۔ اُسے چاہیے کہ ہر وقت یہ یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے خیر و بہتری کا فیصلہ فرمایا ہے جبھی حصولِ علم کا موقع مرحمت فرمایا، کہ حدیث شریف میں ہے "اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا فیصلہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔" لہٰذا طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بات کو محسوس کرے کہ وہ مقدس ترین فریضے کو ادا کر رہا ہے کہ "علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔"

۲

حلال وحرام

عَن النُعمَان بن بشیر، قَال سمعتُ رسول اللہ صَلی اللہ عَلیہ وسَلم یقول "الحلالُ بیّنٌ والحرام بیّنٌ وبینھما مُشتبھاتٌ لایعلمُھا کثیرٌ من النّاسِ فمن اتّقی المُشتبھات استبرأ لدینہ وعِرضہ، ومن وَقعَ فی الشُّبھات کرَاعٍ یرعی حَوْلَ الحمیٰ، یُوشکُ أن یُواقعہُ ألاوَ إنّ لکُلِ ملکٍ حمیً ألاإنّ حمیَ اللہِ فی أرضہِ محارمُہ ألا وإنّ فی الجسَدِ مُضغۃً اذا صَلحتْ صَلحُ الجسدُ کُلُّہُ وَاذا فسدت فسَدَ الجسد کُلہ، ألاوَھیَ القلب۔ (رواہ البخاری)

حضرت نعمان رضؓ بن بشیر سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی۔ اور دونوں کے درمیان کچھ مشکوک اور غیرواضح چیزیں ہیں جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے، پس جوان مشکوک چیزوں سے بچا اس نے اپنے دین اور آبرو کو بے داغ رکھا اور جوان مشکوک چیزوں میں پڑگیا وہ حرام میں پڑگیا، اس چرواہے کی طرح جو اپنے جانوروں کو رکھتؔ کے گرد چراتا ہے قریب ہے کہ جانور

ؔ بادشاہ یا رئیس چراگاہ کا کچھ حصّہ اپنے لیے مخصوص کرلیں تو وہ رکھت کہلاتی ہے۔

رکعت پڑھ لیں۔ ہر بادشاہ کے لیے ایک رکھت ہے۔ اللہ کی رکھت اس کے محرمات ہیں۔ جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے؛ اگر وہ اچھا ہے تو سارا جسم اچھا ہے اور اگر وہ بگڑا تو سارا جسم بگڑ گیا؛ وہ دل ہے۔

اس حدیثِ پاک کی عظمت و شان پر علمائے کرام متفق ہیں کہ یہ ان احادیث میں سے ایک ہے جن پر اسلام کا مدار ہے۔ ایک جماعت کے نزدیک تو یہ حدیث اسلام کا تہائی حصّہ ہے۔ اور اسلام کا محور یہ حدیثِ مذکور اور حدیث "من حُسنِ اِسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ۔ اور حدیث: إنّما الاعمال بالنِّیات ہے۔ ابو داؤد فرماتے ہیں۔ اسلام کا محور چار حدیثیں ہیں تینوں مذکورہ حدیثیں اور چوتھی حدیث:

لَا یُومِنُ اَحَدُکُم حتّٰی یحب لأخیہ ما یُحِبّ لنفسہ۔

تم میں کا کوئی شخص مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

اِس حدیث پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ واضح فرماتے ہیں کہ اللہ ربّ العزّت نے آپؐ کی امت کے لیے اس زندگی میں جو چیزیں حلال فرمائی ہیں اُن سے لطف اندوز ہونا اور فائدہ اُٹھانا جائز و مباح ہے۔ اگر کوئی قید و پابندی ہے تو اس بات کی کہ اس میں اسراف و فضول خرچی نہ پائی جائے، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزوں کو بعض اسباب و مصالح کی بنا، پر جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے حرام فرمایا ہے لہذا بندے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکموں پر چلے اور اس کی نافرمانی سے بچے، کیوں کہ غلام کو اس کا حق نہیں کہ اپنے آقا کے حکم سے سرتابی کرے، حلال و حرام کے علاوہ کچھ ایسے بھی امور ہیں جو مشکوک و مشتبہ ہیں ان کا حلال یا حرام ہونا معلوم نہیں، لہذا مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ ایسی چیزوں کے بارے میں پہلے علماء کی طرف رجوع کرے ان سے اس کا حکم معلوم کرے۔ پھر اس پر عمل کرے۔

اسی وجہ سے علماء نے حلال اور حرام کے احکام کی تین قسمیں کی ہیں :

۱۔ جن چیزوں کا حلال ہونا صاف اور کھلا ہوا ہے جیسے روٹی ، میوہ جات اور زیتون کا تیل۔

۲۔ جن چیزوں کا حرام ہونا معلوم اور کھلا ہوا ہے جیسے شراب ، سُور کا گوشت جھوٹ ، غیبت ، چغل خوری۔

۳۔ مشتبہ جس کا حلال یا حرام ہونا واضح نہیں کہ وہ حلال ہے یا حرام لہٰذا مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ ہر اس چیز سے پرہیز کرے جس کے بارے میں شک و شبہ ہو کہ یہ جائز و حلال ہے یا حرام و ناجائز ، تو گناہ سے بچ گیا اور اگر حلال تھی تو شک کی بنا پر اس کو چھوڑ دینے سے اجر و ثواب کا مستحق ہوا۔

امام نووی ؒ فرماتے ہیں کہ :

مشتبہات کا یہ مطلب ہے کہ ان کا حلال و حرام ہونا واضح نہیں جس کی وجہ سے عوام اس سے واقف نہیں ہوتے ، ان کو ایسی چیزوں کا حکم معلوم نہیں ، لیکن علماء ایسی چیزوں کے حکم سے کسی نص ، قیاس یا کسی اور طرح سے واقف ہو جاتے ہیں۔

خطابی کا کہنا ہے کہ :

مشتبہات بعض لوگوں پر مشتبہ ہوتے ہیں سب پر نہیں ، جس کی وجہ یہ ہے کہ اصولِ شریعت میں ان کے لیے کوئی واضح حکم نہیں ہے ، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز ایسی نہیں چھوڑی جس کا حکم نہ واضح فرما دیا ہو لیکن بہت سے لوگ (کم علمی کے سبب) اس سے واقف نہیں ہوتے۔

انھیں وجوہات کی بنا پر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ مشتبہات کو معلوم کرنے کی فکر کرے اور ان سے بچے تاکہ اپنے دین اور عزت و ناموس کو محفوظ رکھ سکے۔ یہ بچنا دل کے اندر پرہیز و تقویٰ کی کیفیت کے پائے جانے پر منحصر ہے اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر و تسبیح ، اطاعت و عبادت اور صلحائے اُمّت کی ہم نشینی

اختیار کرکے دل کو پاک صاف رکھنے کا مشورہ دیا ہے کہ دل کی درستی ہی سے پورا جسم صحت مند و تن درست رہتا ہے اور دل کے بگڑ جانے سے پورا نظام جسمانی بگڑ جاتا ہے، حدیث کے یہ آخری الفاظ ہم پھر سے پڑھ لیں "سنو! جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست رہتا ہے تو پورا جسم درست ہوتا ہے اور جب اس میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو پورے جسم کا نظام بگڑ جاتا ہے، سنو وہ دل ہے"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ دل کا ذکر فرمایا - اس لیے کہ وہی پورے نظام جسمانی کا امیر و حاکم ہے ۔امیر و حاکم صحیح ہوتا ہے تو رعیت بھی نیک چلن ہوتی ہے اور امیر و حاکم کا چلن بگڑتا ہے تو رعیت بھی بگڑ جاتی ہے۔اس حدیث پاک میں دل کی قدر و منزلت کی اہمیت سے باخبر فرمایا گیا ہے اس کے درست و صحیح رکھنے پر زور دیا گیا ہے اور یہ اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ دل پر حلال کمائی اور اچھے عمل کا اثر پڑتا ہے۔

اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ قَلْبًا سَلِیْمًا۔

اے اللہ میں تجھ سے قلبِ سلیم کا طلب گار ہوں۔

قلبِ سلیم وہ ہے جو ہر قسم کے شیطانی اثرات اور برائیوں سے محفوظ ہو یہ دل وہ دل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی محبت بسی ہو اور ان چیزوں کا خوف سمایا رہتا ہو جو اس کی محبت سے دور کرتی ہیں ۔مسند امام احمد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے، آپؐ نے فرمایا:

لَا یستقیم ایمان عبد حتی یستقیم قلبہ۔

کسی بندے کا ایمان اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کا دل درست نہ ہو۔

دل کی درستی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور جذباتِ اطاعت سے

بھرا ہوا ہو اور اس کی نافرمانی ناگوار ہو۔ جسم کا عمل دل کے عمل و ارادہ کے تابع ہے۔ اگر دل کا عمل و ارادہ اللہ کے لیے ہے تو دل بھی درست ہوگا اور پورے جسم کا عمل درست ہو جائے گا۔

اسی طرح سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کی بھی وضاحت فرمادی ہے کہ حلال کی فکر، حرام سے پرہیز اور مشتبہات سے دُور رہنے کا دل کے صلاح و بگاڑ میں کیا اثر و دخل ہوتا ہے۔ اس حدیث پاک کی عظمت کا یہی سب سے بڑا راز ہے۔

ماوردی کا کہنا ہے کہ:

"علماء نے اس حدیث کی عظمت سے اس لیے زور دے کر آگاہ فرمایا ہے کہ انسان کو جب جسم و دل دونوں کی پاکی حاصل ہوتی ہے تبھی اس کی عبادت صحیح معنوں میں عبادت ہوتی ہے۔"

حدیث کا فقہی پہلو

حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چیزوں کی اصل حلال ہے جب تک کہ قرآن و حدیث سے اس کی حرمت نہ ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"یا ایھا الذین اٰمنوا کلوا من طیبات ما رزقنا کم واشکروا للہ ان کنتم اِیَاہ تعبُدون۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلیکم المیتۃ والدَّمَ ولَحْمَ الخنزیر۔"

اے اہلِ ایمان! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو عطا فرمائی ہیں ان کو کھاؤ اور اگر خدا ہی کے بندے ہو تو اس (کی نعمتوں) کا شکر بھی ادا کرو، اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو اور سُور کا گوشت حرام کر دیا ہے۔

پہلی آیت سے چیزوں کا مباح ہونا اور دوسری سے حرام ہونا معلوم ہوتا ہے۔

فقہ کا ایک عام قاعدہ ہے کہ نشہ پیدا کرنے والی ہر چیز حرام ہے۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا أَسْكَرَ كَثِيرُهُ فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ۔

جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے اس کی کم مقدار بھی حرام ہے۔

اس فقہی قاعدے میں بہت سے مشتبہات بھی آجاتے ہیں۔

موجودہ حالات اور حدیث

اِس حدیث سے معلوم ہوا:

۱. اسلام نے فحش، ناپسندیدہ اور نقصان دہ چیزوں کو حرام کیا، فرمایا:

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔

۲۔ قرآن کریم نے مُردار کو حرام قرار دیا ہے، اب طبّی تجربات نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ ان حرام کی ہوئی چیزوں میں بے شمار جراثیم پائے جاتے ہیں۔ جو صحتِ انسانی کے لیے نہایت مضر ہوتے ہیں۔

۳۔ کچھ ہی عرصہ قبل طبی تجربہ گاہوں (لیباریٹریز) نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ خنزیر کے گوشت اور خون میں ایسا خطرناک و سخت جان (ایسا کیڑا جو سوت کی طرح سے پھیلتا ہے) ہوتا ہے جو پریشر کوکر میں پکانے کے بعد بھی نہیں مرتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے ذریعے جن چیزوں کو حرام اور حلال فرمایا ہے ان کی حلّت اور حرمت میں کتنی زبردست حکمت و مصلحت پوشیدہ ہے۔

۳

طہارت جزوِ ایمان ہے

عن أبی مالک الأشعری قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الطُّھور شطر الایمان، والحمد للہ تملأ المیزان وسبحان اللہ والحمد للہ تملآن او تملأ ما بین السّمٰوات والارض، والصلاۃ نور، والصدقۃ برھان، والصبر ضیاءٌ والقرآن حُجّۃٌ لک او علیک، کلُّ النّاس یغدو فبائعٌ نفسہ فمُعتقھا أو موبقھا۔ (رواہ مسلم)

ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: طہارت اور پاکیزگی جزوِ ایمان ہے اور کلمۂ الحمد للہ میزانِ اعمال کو بھر دیتا ہے اور سبحان اللہ والحمد للہ آسمانوں اور زمینوں کو بھر دیتے ہیں اور نماز نور ہے اور صدقہ دلیل و برہان ہے اور صبر اُجالا ہے اور قرآن یا تو حجت ہے تمہارے حق میں یا حجت ہے تمہارے خلاف، ہر صبح کے بعد انسان اپنی جان کا سودا کرتا ہے پھر یا تو اسے نجات دلا دیتا ہے یا اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔

اِس حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی طرح سے رہنمائی فرمائی ہے۔ اگر مسلمان اس حدیث پر عمل کریں تو ہر زمانے اور ہر جگہ کے لیے اس میں دنیا اور آخرت دونوں جہاں کے لیے روشنی اور رہنمائی موجود ہے۔ لیکن اگر اس پر عمل کرنے میں کوتاہی یا تجاہل برتیں گے تو اس کا انجام نقصان اور گھاٹے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث کی ابتداء اسلام میں پاکیزگی اور صفائی ستھرائی کی جو اہمیت ہے، اس سے فرمائی ہے۔ چناں چہ بہت ہی مختصر الفاظ میں فرمایا "طہارت اور پاکیزگی جزو ایمان ہے" اور اس میں کسی بھی شک وشبہ کی گنجایش بھی نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت آپ پر دعوت اسلام کی ذمہ داری ڈالی تو سب سے پہلے پاکی حاصل کرنے کا حکم دیا، فرمایا:

یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ، وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ، وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ ○

اے (محمد) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو! اُٹھو اور لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراؤ اور اپنے پروردگار کی بڑائی کرو۔ اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور ناپاکی سے دُور رہو۔

اسی طرح نماز پڑھنے کے لیے حصولِ طہارت کو اللہ تعالیٰ نے واجب فرمایا، ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الذین اٰمنوا اذا قمتم إلی الصّلاۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم إلی المرافق وامسحوا برؤوسکم وارجلکم إلی الکعبین وان کنتم جُنبًا فاطھروا۔

مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو، تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو اور سر کا مسح کرلیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھولیا کرو) اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو نہا کر پاک ہوجایا کرو۔

ممکن ہے کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ نماز کے لیے حصولِ طہارت یعنی وضو کیوں ضروری قرار دیا ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز میں بندہ اللہ پاک کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اس سے ملتا اور ہم کلام ہوتا ہے، اپنی عاجزی اور درماندگی ظاہر کرتا ہے، روتا گڑگڑاتا

ہے۔ لہذا اس احکم الحاکمین کی بارگاہ میں حاضری کے لیے دل کے رجوع وانابت کے ساتھ جسمانی طہارت اور پاکیزگی بھی ضروری قرار پائی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا:

یَا بَنِیْ آدَمَ خُذُوا زِینَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ۔

اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنے تئیں مزین کیا کرو۔

طہارت اور پاکیزگی کے معنی بہت وسیع ہیں۔ نماز مومن کی اصلاح و تربیت کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ وضو اور غسل سے صرف جسم کی صفائی نہیں مقصود ہے بلکہ اس کا تعلق جسم کی صفائی کے ساتھ رُوح کی پاکی اور قلب و نظر کی دُرستی سے بھی ہے، پاکی ایک عبادت ہے جس کے ذریعے بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، پاک صاف ہوکر خضوع کے ساتھ اس کے روبرو کھڑا ہوتا ہے۔

صفائی ستھرائی اور طہارت و پاکی کے سلسلے میں دین اسلام کے اہتمام کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک کے ذریعے مُنہ کی صفائی کا حکم فرمایا ہے اور اس کی فضیلت کے بارے میں بہت سی حدیثیں وارد ہیں حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے، فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مسواک منہ کو صاف کرنے والی اور اللہ کو راضی کرنے والی ہے)

مٹی سے بنا ہوا یہ انسان جب اس ذات عالی سے مخاطب ہونا چاہے جو سب کی حاکم اور سب کی مالک ہے تو جتنی بار اور جتنے اہتمام سے اپنے منہ کو صاف کرے کم ہے اسی لیے کسی صاحب دل نے بے خودی اور سرمستی میں کہا ہے ؎

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

میں ہزار بار اپنے منہ کو مشک و گلاب سے دھوؤں اور صاف کروں تب بھی اس سے آپ کا پاک نام بڑی بے ادبی ہے

مسواک کے سلسلے میں آپؐ کی تاکید و ہدایت بڑی حکمتوں پر مبنی ہے، اس وقت طبّی تحقیقات سے مسواک کے جو فوائد سامنے آرہے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسواک کے بارے میں آپ کی ہدایات معجزہ ہیں۔

مسواک کی خوبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں بہت سے قدرتی مضبوط ریشے ہوتے ہیں جو دانتوں سے دبانے پر بھی ٹوٹتے نہیں ہیں بلکہ نرم ہوکر دانتوں کے درمیان داخل ہوجاتے ہیں اور فضلات کو اس طرح نکال دیتے ہیں کہ مسوڑھوں میں تکلیف نہیں ہوتی اس طرح سے دانت بھی صاف ہوجاتے ہیں اور مسواک کے ریشوں کے اثرات سے جراثیم اور کیڑے بھی مرجاتے ہیں۔

اسلام کے صفائی ستھرائی پر زور دینے کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تم میں سے کوئی سوکر اُٹھے تو جب تک تین بار اپنے ہاتھ دھو نہ لے، برتن میں ہاتھ نہ ڈالے، اس کو معلوم نہیں کہ سوتے میں ہاتھ کہاں کہاں گیا ہے" یہ کتنی معقول بات ہے، سوتے میں آدمی بے خبر ہوتا ہے، ہاتھ جسم کے ہر عضو پر جاتا رہتا ہے، گرمی کا موسم ہے تو پسینہ نکلتا رہتا ہے، سوتے میں کسی اتفاقی نجاست سے ہاتھ ملوث ہوگیا مثلاً سوتے میں کھٹمل، مچھر وغیرہ کا خون لگ گیا ایسی صورت میں ہاتھ کا برتن میں ڈالنا کتنا بُرا ہے۔ انھیں اسباب و وجوہات کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوکر اٹھو تو برتن میں ڈالنے سے پہلے ہاتھ دھولو، اس لیے کہ نہیں معلوم سوتے میں ہاتھ کہاں پڑا ہے، یہ تو ہے بے خبری کی صورت میں ہے، تو جب مومن کو معلوم ہو کہ ہاتھ گندگی سے مس ہوا ہے تو ہاتھوں کی صفائی کا کتنا اہتمام کرنا چاہیے، مثلاً استنجا سے فراغت کے بعد آب دست لیتا ہے تب تو اور بھی جلدی سے اس کو اپنے ہاتھوں کو دھولینا چاہیے کہ کہیں وہ آنتوں کے امراض کا نشانہ نہ بنے، چوں کہ ناخن اس قسم کے امراض کا زیادہ سبب بنتا ہے، لہٰذا آپؐ نے اس کے کاٹنے کا حکم فرمایا:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: پانچ چیزیں فطرت میں داخل ہیں، ختنہ کرنا، موئے زیر ناف کاٹنا، مونچھوں کو کترنا، ناخن تراشنا، بغل کا بال اُتارنا۔

اسی طرح سے جسمانی صحت کی رعایت میں آپؐ نے برتنوں کی صفائی کا حکم دیا تاکہ کھانے پینے کی چیزیں بھی پاک صاف رہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: (اگر تم میں سے کسی کے برتن میں کُتّا پانی پی لے تو اس برتن کو سات مرتبہ دھوئے) برتنوں کی صفائی الگ ایک اہمیت رکھتی ہے اس لیے کہ برتنوں کی صفائی میں کوتاہی برتنے کی وجہ سے انسان مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

انھیں وجوہات کی بنا پر آپؐ نے ایک عام بات فرمائی کہ پاکی جزءِ ایمان ہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کلمات کا ذکر فرمایا جن سے روحانی اور قلبی پاکی حاصل ہوتی ہے۔

فرمایا: کلمۂ الحمد للہ میزان اعمال کو بھر دیتا ہے، اور سبحان اللہ والحمد للہ بھر دیتے ہیں آسمانوں اور زمینوں کو۔ اس حدیثِ پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس خوبی کے ساتھ تن من دونوں کی پاکی اور صفائی کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے یہ دونوں قسم کی پاکیاں دین میں شامل ہیں، جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور اس کو ضروری قرار دیا ہے، ارشاد فرمایا:

مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلٰكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ۔

خدا تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے۔

ہم بعض فقہا اور عابدین کو دیکھتے ہیں کہ وہ صرف بدن کی پاکی کی فکر کرتے ہیں اور دل کی پاکی کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس کا حکم واجب و مستحب دونوں حیثیتوں سے

ہے۔ یہ فقہا، طہارت کا مطلب بس اتنا ہی سمجھتے ہیں[1]۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا (الصّلاۃ نورٌ) نماز ایمان کا نور ہے جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے تاکہ نمازی گناہ کی راہوں سے بچ سکے اور راستے کے پیچ وخم اس پر کھل جائیں، اس لیے کہ نماز منکر اور بے حیائی کی باتوں سے روکتی ہے اور سیدھی راہ نجات ہے۔ نماز دل کو زندگی کے میل کچیل سے پاک صاف کرتی ہے اور دل منور ہوکر بھلائی کی راہوں کو روشن کردیتا ہے، غرضے کہ نماز نور اور روشنی بھی ہے، پاکیزگی اور صفائی بھی ہے۔ جو مسلمان نماز کا پابند ہوتا ہے، دنیا میں بھی اس کے چہرے پر رونق ہوتی ہے اور قیامت کے دن تو نمازی کا چہرہ چمک رہا ہوگا۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا "صدقہ دلیل و برہان ہے" اس لیے کہ جب بندۂ مومن نے دین کے بنیادی ارکان کی تکمیل کرلی تو نوافل کی طرف متوجہ ہوا۔ صدقات بھی نوافل ہی میں شامل ہیں جو مادی اور مالی پاکی ہے یہ عقل و دل کی پاکی کے بعد ہوتا ہے کیوں کہ قیامت کے دن جب بندے سے سوال ہوگا کہ اپنے مال کو کہاں خرچ کیا تو صدقہ دلیل بنے گا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ صدقہ اپنے کرنے والے کے ایمان کا ثبوت بنے گا۔ چناں چہ منافق صدقہ نہیں کرتا اس لیے کہ اس کو صدقے کے ایمان کی دلیل و ثبوت ہونے کا اعتقاد نہیں، جس نے صدقہ کیا اس نے اپنے ایمان کے صحیح ہونے کا ثبوت فراہم کرلیا ہے۔

پھر آپؐ نے فرمایا کہ: صبر روشنی اور نور ہے، جس سے معلوم ہوا کہ مصائب و پریشانیوں پر صبر، ایمان کے پختہ ہونے کا پیمانہ ہے۔ ابن عطاء کا قول ہے کہ مصائب پر حسنِ ادب کے ساتھ قائم رہنے کا نام صبر ہے۔

صبر کی حقیقت یہ ہے کہ انسان تقدیر کے فیصلے پر راضی رہے، مصیبت کا

---

[1] فتاویٰ علامہ ابن تیمیہ ج ۱ ص ۱۵

اظہار خبر و اطلاع کے طور پر معیوب نہیں، ہاں بطور شکایت اس کا اظہار صبر کے منافی ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ۔"

بے شک ہم نے ان کو ثابت قدم پایا، بہت خوب بندے تھے۔
بے شک وہ رجوع کرنے والے تھے۔

حالاں کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے عرض کیا تھا:

إِنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ۔

"مجھے ایذا ہو رہی ہے۔"

عبارتِ بالا سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ دعوت و ارشاد کا راستہ امتحان و آزمایش اور محنت و مشکلات سے پُر ہے۔ لہٰذا جن خوش نصیبوں کو اللہ تعالیٰ نے اس اہم اور نازک کام کو انجام دینے کی توفیق دی ہے وہ اس راہ میں پیش آنے والی ہر تکلیف اور دشواری پر صبر و ثبات سے کام لیں اور آپؐ کے اسوۂ مبارکہ کو اپنا شعار بنائے رکھیں، کہ آپؐ نے دعوتِ اسلامی کی راہ میں صبر و قربانی کا اعلیٰ نمونہ پیش فرمایا ہے۔

آپؐ نے اس حدیث میں مزید فرمایا: "اور قرآن حجت ہے تمہارے حق میں یا حجت ہے تمہارے خلاف" قرآن کریم کی تلاوت اور اس میں جو احکام ہیں، ان پر عمل کرنا اور اس کے آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھنا، یہ سب چیزیں دل کو پاک کرتی ہیں، عقل کو جلا بخشتی ہیں اور ضمیرِ انسانی میں ورع و تقویٰ پیدا کرتی ہیں۔ شعور و احساسات میں نظافت و ستھرائی اور عمل و کردار میں حق استقامت پیدا کرتی ہیں۔

اس کے برعکس تلاوت نہ کرنا اور قرآنی احکام پر عمل سے دُور رہنا محرومی و نامرادی لاتا ہے، اخیر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیثِ پاک کو ان الفاظ پر ختم فرماتے ہیں (ہر آدمی صبح کرتا ہے پر وہ اپنی جان کا سودا کرتا ہے، پھر یا تو اسے

نجات دلا دیتا ہے یا اس کو ہلاک کر دیتا ہے) یعنی لوگ زندگی کی گزرگاہوں اور اس کے مختلف میدانوں میں چلتے ہیں، تو کچھ تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو خداوند قدوس کی عبادت وطاعت کے ذریعے اپنے آپ کو عذاب سے آزاد کرا لیتے ہیں اور کچھ وہ ہوتے ہیں جو اپنے کو خواہشات نفسانی اور شیطان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جو اسے ہلاک و برباد کر دیتا ہے۔

حدیث کا فقہی پہلو

ہر قسم کے حدث سے طہارت حاصل کرنے کے لیے نیت شرط ہے۔ وضو، غسل یا تیمم بغیر نیت کے صحیح نہیں ہوگا، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ، اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، اس سے ثابت ہوا کہ کوئی شرعی عمل بغیر نیت کے درست نہیں ہوسکتا۔

اس لیے وضو، غسل، تیمم یہ سب حدث سے پاکی حاصل کرنے کے لیے ہیں، لہٰذا بغیر نیت کے صحیح نہیں ہوں گے۔ نیت کا تعلق دل سے ہے یعنی دل کا ارادہ ہی نیت ہے۔

طہارت کی نیت اس طرح ہوگی کہ جو عمل طہارت کے بغیر کرنا جائز نہیں وہ جائز ہو جائے، جیسے نماز اور کلام پاک کا چھونا اور نیت حدث کے دور ہونے کی کرے۔ اور اگر طہارت ایسے عمل کی نیت سے حاصل کی جس کے لیے شرعاً طہارت نہیں ہے، مثلاً ٹھنڈک حاصل کرنے کی غرض سے، کھانا کھانے، بیع وشراء کرنے یا نکاح جیسے کام کے لیے اور شرعی طہارت کی نیت نہیں کی، تو اس کا حدث دور نہیں ہوگا اس لیے کہ اس نے طہارت کی نیت نہیں کی، جب کسی چیز کی نیت نہیں کی تو اس کو کوئی چیز نہیں حاصل ہوئی اس شخص کی طرح جس نے کسی چیز کا ارادہ ہی نہ کیا ہو۔

موجودہ حالات اور حدیث

مذکورہ حدیث طہارت کے وسیع معنی پر دلالت کرتی ہے، اس طرح سے ہاتھوں کی پاکی کو قلب و نظر، ذکر، صدقہ اور صبر کے ساتھ ملا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو طہارت کی بہترین شکل شمار فرمایا ہے، پھر اخیر میں فرمایا کہ تلاوتِ قرآن ذکر کی سب سے افضل صورت ہے۔

حدیث سے طہارت کا ایک نیا نقشہ سامنے آتا ہے۔ طہارت کا یہ رنگ خدائی معاشرے ہی میں پایا جاتا ہے جو اس معاشرے کا نمایاں وصف ہوتا ہے اور ان تمام دوسرے معاشروں سے الگ و ممتاز ہوتا ہے جو صرف شکل و ظاہر میں صفائی ستھرائی کا اہتمام کرتے ہیں۔

پاکی کی ایک صورت مسواک بھی ہے وہ جراثیم کو مارتی ہے منہ کو بیماریوں سے بچاتی ہے، طبی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ مسواک میں جو مادے پائے جاتے ہیں وہ ان جراثیم اور کیڑوں کو مارتے ہیں جو دانتوں اور مسوڑھوں کے اندر موجود ہوتے ہیں۔

طہارت کی سب سے نمایاں صورت سونے اور استنجا سے فراغت کے بعد ہاتھوں کا اچھی طرح دھونا ہے تاکہ ہاتھ جراثیم اور آنتوں کو نقصان پہنچانے والے اثرات سے صاف ہو جائیں۔

———— ٭ ————

۴

دین خیر خواہی کا نام ہے

عن تمیم الداری انّ النّبی صلی اللہ علیہ وسلم قال :
" الدّین النّصیحۃ - قلنا : لمن ؟ قال : لِلّٰہ ، ولکتابہ ، و لرسولہ ، ولائمۃ المسلمین وعامتھم - (مسلم)

حضرت تمیم داری رضؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : دین خیر خواہی کا نام ہے ۔ ہم نے پوچھا کس کے لیے ۔ فرمایا ، اللہ کے لیے ، اس کی کتاب کے لیے ، اس کے رسول کے لیے ، مسلمانوں کے امیر کے لیے اور ان کے عوام کے لیے ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الدین عند اللہ الاِسلام - (آل عمران ۱۹)

اللہ پاک نے اس دین کو اس لیے منتخب فرمایا ہے کہ اس کے ذریعے ایک زبردست اُمت کو وجود میں لائے ، اس دین کے ذریعے حکومت بھی قائم کرے ، ایک معاشرہ تشکیل دے اس میں انسانی ضمیر ، اخلاق اور عقلوں کی تربیت کرے تاکہ اس کے ذریعے اس معاشرے کا تعلق اپنی ذات سے جوڑے اور اسلامی حکومت کا دوسری حکومتوں سے ربط وتعلق قائم کرے اور ان سب کو ایک ایسی مضبوط لڑی میں پرو دے ۔ جو منتشر اجزاء کو جمع کر کے باہم ملا دے ۔ اور پھر سب کو اخلاص ونصیحت کے سرچشمے سے ملا دے ، ایک ہی رُخ پر چلائے ، یہی حقیقی معنی میں وہ دین ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ، " انّ الدین عند اللہ الاِسلام " یہی وجہ ہے کہ اس کو مزید طاقت

پہنچانے اور موکّد کرنے کے لیے حدیث شریف میں الدین النصیحۃ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے زیادہ جامع لفظ لغت میں ملنا مشکل ہے، اسی وجہ سے اس حدیث کو دین کا چوتھائی حصہ کہا گیا ہے۔ امام نوویؒ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ تنہا اس حدیث سے دین کے پورے مقاصد حاصل ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ نصیحت کا مطلب اس کی اطاعت و فرماں برداری، اس کے آگے جھکنا، تنہا اسی کو رب اور معبود ماننا، اس کے ایک ہونے کے عقیدے کو درست رکھنا، عبادت صرف اسی کی رضا کے لیے کرنا زندگی گزارنے کا طور طریق، اس کا قانون و ضابطہ اس کی قدریں، معیار اور پیمانے سب اسی سے لے کسی اور کو ان ساری چیزوں میں قطعاً شریک نہ کرے۔

لہٰذا دین میں اخلاص اس بات کا متقاضی ہے کہ ان تمام باتوں کو ترک کر دیا جائے جن سے شرک کی بو آتی ہو، جیسے اللہ کے علاوہ کسی اور کی تعظیم و اطاعت اس طرح کرنا جس طرح خدائے پاک کی تعظیم و اطاعت کی جاتی ہے مثلاً غیر خدا سے کچھ مانگنا یا اس کو دین کے اصول سے ہٹ کر وسیلہ بنانا۔ بندے کو یہی حکم ہے کہ وہ صرف خدا کی عبادت کرے، دین کو اس کے لیے خالص کرے، کسی سے محبت ہو تو اللہ کے لیے، ناراضی ہو تو اللہ کے لیے، اللہ کے فرماں بردار بندوں سے دوستی رکھے اور نافرمانوں سے دشمنی — اپنے سارے کاموں میں بس اللہ ہی کی رضا کو پیشِ نظر رکھے۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب کے لیے خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس پر خدا کے کلام ہونے کا یقین رکھے، اس کے احکامات پر عمل کرے، اس سے پُر خلوص محبت ہو اس کا بہت ادب کرے کہ وہ خدا کا کلام ہے اس میں اس کی عظمت و کبریائی کا بیان ہے، پورے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی تلاوت کرے، اس میں جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے ان پر عمل کرے اور جن باتوں سے روکا گیا ہے اُن سے رُک جائے، اس کے علوم و معارف کو سمجھے، آیات پر غور کرے، معاشرتی زندگی کے لیے اس میں احکام ہیں، انھیں کی روشنی میں معاشرتی مسائل و معاملات کو حل کرے،

حکومتی سطح پر ایک ملک کا دوسرے ملک سے ربط و تعلق کا جو اصول بتایا گیا ہے اس کو اپنایا جائے۔ یہ تمام کی تمام باتیں "النّصیحۃ لکتابہ" میں آگئیں۔

اللہ کے رسولؐ کے ساتھ نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی سنّتوں کو سکھایا جائے۔ اپنے قول و فعل میں اُن کو جاری کیا جائے، آپؐ کی ذات سے محبت ہو، آپؐ کے متبعین سے محبّت ہو، یہ "نصیحت" صرف الفاظ نہیں جو زبان سے دُہرائے جائیں اور دل میں کیف و احساسِ عبدیت نہ کروٹ لے رہا ہو کہ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت اور اس خدائی دستور پر عمل ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کی زبان سے اس طرح کہلوا رہا ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ۔

"(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے، کہہ دو کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم مانو، اور اگر نہ مانیں تو خدا بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔"

پہلی آیت کی تفسیر میں مفسر ابن کثیر فرماتے ہیں۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کیا اور حضورؐ کے طریقے کو نہیں اپنایا تو وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے، تا آنکہ اپنے تمام قول و فعل میں شریعتِ محمدی اور سنّتِ نبوی پر عمل پیرا نہ ہو۔

جب اخلاق و معاملات کی اساس و بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضا اور اتباعِ رسولؐ ہو گی تو مسلم معاشرے کا ہر فرد ہمدردی، بھلی راہ دکھانے، خلوصِ دل سے زندگی اور معاشرے میں عمومی اصلاح و سدھار کا فکر مند ہو گا۔

مسلمان حکام کے ساتھ نصیحت کا مطلب حق کے معاملے میں ان کا تعاون، ان کی

فرماں برداری، نرمی و محبت کے ساتھ ان کو مشورہ دینا اور قانونِ خداوندی پر عمل کرنے کی ترغیب دینا، غلطی کریں تو ان کو متنبہ کرنا، ان کی بہتری، بھلائی اور عدل و انصاف کا خواہاں رہنا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے معاملے میں پوری اُمت کا متفق اور دین پر عمل پیرا رہنا ہے۔

عام مسلمانوں کی نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے لیے پسند کرے وہ تمام مسلمانوں کے لیے پسند کرے، اور جو اپنے لیے ناپسند کرے، وہ تمام مسلمانوں کے لیے ناپسند کرے، مسلمانوں پر مہربان رہے، چھوٹوں پر رحم کرے، بڑوں کی عزت و تعظیم کرے، ان کے رنج سے رنجیدہ اور خوشی سے خوش ہو، چاہے اس کو اپنے اس رویّے سے دُنیوی نقصان ہی کیوں نہ ہو رہا ہو۔ مثلاً سودے کے بھاؤ کو کم رکھنا خواہ اس سے بڑا نفع نوت ہو رہا ہو، ان کی ضروریات و کاروبار میں رہنمائی کرنا، دین و دنیا کی باتوں کو سکھانا، ان کے عیوب کو چھپانا، ضروریات کا پورا کرنا، ان کے دشمنوں کے خلاف ان کی مدد کرنا، ان کو دھوکا دینے اور ان پر حسد کرنے سے بہت دور رہنا ان کی بہی خواہی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ تکلیف دہ اور ناپسندیدہ چیزوں کو ان سے دُور کرے، حقوق میں محتاجوں کو مقدم رکھے، بے پڑھوں کو تعلیم دے، ان میں سے جو شخص اپنے قول و عمل میں راہِ راست سے ہٹ گیا ہو اس کو حکمت کے ساتھ خوش اخلاقی اور اچھے انداز میں راہِ راست پر آنے کی نصیحت کرنا اور سمجھانے میں نرم انداز اپنانا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے "کاش کہ میں تمہارے معاملے میں کتاب اللہ پر عمل کر پاتا اور تم بھی اس پر عمل کرتے۔"

اس مفہوم کی وضاحت سنن میں مذکور عبداللہ بن مسعودؓ اور زید بن ثابتؓ کی ایک اور حدیث سے ہوتی ہے —— تین چیزیں ایسی ہیں جن میں مومن خیانت نہیں کر سکتا، اللہ کے لیے اخلاص، حکام کی بہی خواہی، مسلمانوں کی جماعت سے جڑے رہنا —— ان تینوں باتوں نے اپنے اندر دین کے اصول و قواعد کو سمو لیا ہے، وہ

خدا اور بندوں دونوں کے حقوق پر مشتمل ہیں۔ دنیا اور آخرت دونوں کے تقاضوں کو پُورا کرتی ہیں۔

اسلاف کا یہ طریقہ تھا کہ جب کسی کو نصیحت کرنا چاہتے تھے تو اس کو تنہائی میں سمجھاتے تھے۔ بعض بزرگوں نے تو یہاں تک فرمایا: "جس نے اپنے بھائی کو تنہائی میں نصیحت کی اور سمجھایا تو یہ نصیحت کہلائے گی، اور جس نے کھلے عام سمجھایا تو اُس نے اس کو عار دلایا اور ملامت کی، مومن کا شیوہ چھپانا اور سمجھانا ہے، عار دلانا یا رسوا کرنا فاجر کا شیوہ ہے، جب اخلاق و معاملات اس اخلاص و نصیحت کے سانچے میں ڈھلیں گے جس کا حدیثِ پاک میں ذکر ہے تو لوگوں کے اخلاق و معاملات میں مادّیت اور نفع اندوزی کا رُجحان کمزور پڑ جائے گا اور جب اخلاق کی بنیاد و اساس، نصیحت و اخلاص ہوگی اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس سے ثواب کی اُمید پیشِ نظر ہوگی، اس کے عذاب سے خوف ہوگا تب مسلمان زندگی اور معاشرے کی عام اصلاح اور سدھار کے معاملے میں صحیح معنوں میں ناصح اور خیر خواہ ہوگا۔

حدیث کا فقہی پہلو

مسلمان حکام کی بہی خواہی اور ان کی اطاعت ہر مسلمان پر واجب ہے چاہے حاکم نے مسلمانوں سے اس کا عہد نہ لیا ہو۔

اہلِ علم اور بااقتدار حکام کی اطاعت واجب ہے اگر وہ خدا و رسولؐ کی اطاعت کا حکم کرتے ہوں تو۔ حدیثِ صحیح میں حضورؐ کا ارشاد ہے، مسلمان شخص پر ماننا اور اطاعت کرنا تنگ دستی و خوش حالی، پسند و ناپسند دونوں صورتوں میں ضروری ہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے۔ اگر اس کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر ماننا اور اطاعت کرنا جائز نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: خدا کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی اطاعت درست نہیں۔"

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ اللہ، اس کی کتاب اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت صرف خدا کے حقوق اور اس کی عبادت میں داخل ہیں، کوئی اس کا شریک نہیں، یہ محض اللہ ہی کی رضا و خوشنودی کے لیے ہوگا۔

مسلمان پیشواؤں اور ان کے عوام کی بھی خواہی حکام کی بھی خواہی اور جماعت سے جڑے رہنے کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں کا جماعت سے جڑے رہنا، یہی عوام کی نصیحت و بھی خواہی ہے۔

۲۔ رہی ہر مسلمان کے لیے ہمدردی و نصیحت تو بعض صورتوں میں ممکن ہوگی اور بعض حالات میں ناممکن۔ ایسی صورت میں کوئی شخص قابلِ ملامت نہ ہوگا۔

۳۔ دین بھی خواہی کا نام ہے۔ جب اس لفظ کا سب سے نمایاں اور اہم مفہوم اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت اس کے رسول ؐ اور مومن حکام کی اطاعت ہے تو ہم مسلمانوں کے لیے کتنا ضروری ہے کہ اجتماعیت اور باہم میل ملاپ کو اپنا شعار بنائیں اور اختلاف اور پھوٹ سے باز آجائیں اور اپنے پیش رووں کے لیے دعا و استغفار کریں۔

۵

نیکی کی دعوت اور بُرائی سے روکنے کی اہمیت

حدثنا ابوبکر بن أبی شیبة حدثنا وکیع عن سفیان وحدثنا المثنیٰ حدثنا محمد بن جعفر حدثنا شعبة کلاھما عن قیس بن مسلم عن طارق بن شھاب و ھذا حدیث أبی بکر قال: اوّل من بدأ بالخطبة یوم العید قبل الصلوٰة مروان فقام الیه رجل، فقال، الصلوٰة قبل الخطبة فقال: قد ترک ما ھنالک، فقال ابوسعید: أما ھذا فقد قضیٰ ما علیه، سمعت رسُول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول "من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ، فان لم یستطع بلسانه فان لم یستطع فبقلبه وذلک أضعف الایمان۔ (مسلم)

ابوبکر ابن ابی شیبہ فرماتے ہیں: عید کے دن نماز سے قبل جس شخص نے خطبہ دیا وہ مروان ہے جب اس نے نماز سے قبل خطبہ دیا تو ایک شخص نے اعتراض کیا کہ نماز سے پہلے خطبہ؟ تو اس نے کہا، اب یہ معمول نہیں رہا ہے۔ ابوسعیدؓ نے کہا بہر حال اس شخص نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ:

"تم میں سے جو شخص بھی غلط کام کو دیکھے اس کو اپنے ہاتھ سے روک دے، اگر اس پر قادر نہ ہو تو زبان سے منع کرے اور اگر یہ

بھی نہ کر سکے تو اس کو دل سے بُرا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔[1]

اچھائی کی دعوت دینا، اور بُرائی سے روکنا، یہ وہ دو[2] اہم بنیادی ستون ہیں جن پر معاشرے کی بہتری و درستی کا انحصار ہے۔ بھلائی کا حکم دینا اور بُرائی سے روکنا مت مسلمہ ہی کا امتیاز ہے، جیسا کہ وہ اپنی روایات، صفات و خصوصیات میں دوسری قوموں سے ممتاز و نمایاں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

کنتم خیر اُمۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر و تومنون باللہ۔ (آل عمران - ۱۱۰)

مومنو! جتنی اُمتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو، اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت اس طرح بیان فرمائی ہے:

یأمرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث۔ (اعراف ۱۵۷)

"وہ انھیں نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور برے کام سے روکتے ہیں اور پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں۔"

بہترین اور مثالی مسلم معاشرہ جو سختی سے دین پر جما ہوا ہو، اس کی سب سے نمایاں نشانی اور پہچان اور خوبی و خصوصیت یہی ہے کہ اس میں بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا رواج اور چلن ہو، اس میں ایسے افراد پائے جاتے ہوں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

---

[1] عوام کی رعایت کرتے ہوئے پوری سند کا ترجمہ مناسب نہیں سمجھا گیا کیوں کہ باعثِ طوالت ہے۔

کے حکم کو دل کے کانوں سے سنتے ہوں اور اس پر عمل کرتے ہوں۔ بہرحال یہ بات تو متعین ہے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ معاشرے کی خیر و بہتری اور اس کے فساد اور بگاڑ کا تعلق شریعت کے محافظین اور اس نازک ذمہ داری کے سلسلے میں ان کے فکر و اہتمام سے ہے، وہ اصلاح کے جتنے فکرمند ہوں گے، اتنا ہی معاشرے میں سدھار پیدا ہوگا اور کوتاہی برتنے کی صورت میں معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوگا۔ دعوت کا یہ کام نہایت نازک و پرخطر ہے، اللہ کی راہ میں اس نازک ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے میں انبیاء کرام اور داعیوں کو ہمیشہ ابتلاء و آزمائش کے دور سے گزرنا پڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ ويقتلون النبيين بغير حق ويقتلون الذين يأمرون بالقسط من الناس نبشرهم بعذاب أليم - (آل عمران۔۲۱)

"جو لوگ خدا کی آیتوں کو نہیں مانتے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے رہتے ہیں اور جو انصاف (کرنے) کا حکم دیتے ہیں، انھیں بھی مار ڈالتے ہیں ان کو دکھ دینے والے عذاب کی خوش خبری سنا دو۔"

معقل بن ابو مسکین آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں انبیاء کرام آسمانی صحیفے کے بغیر آتے تھے تو بنی اسرائیل ان انبیاء کرام کو قتل کر دیتے تھے۔ ان انبیاء کرام کے متبعین دعوت کا کام شروع کرتے، ان کو عدل و انصاف کا حکم کرتے تو یہ لوگ ان کو بھی قتل کر دیتے تھے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وہ بدترین لوگ ہیں جو عدل و انصاف کا حکم دینے والوں کو قتل کرتے ہیں، وہ بدترین لوگ ہیں جو نہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں نہ برائی سے روکتے ہیں، وہ بدترین لوگ ہیں جن کے شر سے بچنے کے لیے مومن کو تقیہ سے کام لینا پڑتا ہے۔"

اس طرح کی آیات و احادیث کثرت سے پائی جاتی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام گزشتہ قوموں پر بھی واجب تھا، اس لیے کہ یہ اسلامی زندگی کی رُوح اور اساس ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر قرطبی فرماتے ہیں کہ وہ رسالت کا فائدہ اور نبوت کی میراث و جانشینی ہے۔ حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے نیکی کی دعوت دی اور منکر و ناپسندیدہ باتوں سے روکا وہ روئے زمین پر خدا کا خلیفہ، اس کے رسول کا جانشین اور اس کی کتابوں کا قائم مقام ہے۔"

درّہ بنت ابو لہب فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما تھے اسی حال میں ایک شخص آیا اور عرض کیا، اللہ کے رسولؐ لوگوں میں سب سے بہتر کون شخص ہے؟ آپؐ نے فرمایا "لوگوں میں جو شخص سب سے زیادہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا ہو اور سب سے بڑھ کر اللہ کے حکموں کا پاس و لحاظ کرنے والا ہو، رشتوں کو سب سے زیادہ جوڑنے والا ہو۔"

امام نوویؒ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر روشنی ڈالتے ہوئے اس طرح وضاحت فرمائی ہے، فرماتے ہیں " وہ نہایت اہم بات ہے، یہی صلاح و فلاح کی اصل روح ہے، جب خباثت و برائی بڑھ جاتی ہے تو اس کی سزا نیک و بد دونوں ہی کو ملتی ہے، اگر نیک لوگ بُروں کو برائی سے نہیں روکتے، ظالم کا ہاتھ نہیں پکڑتے تو جلد ہی اللہ تعالیٰ سب کے سب کو سزا دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فليحذر الذين يخالفون عن أمره أن تصيبهم فتنة او يصيبهم عذاب أليم۔ (نور - ٦٣)

"جو لوگ اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیے کہ ایسا نہ ہو کہ ان پر کوئی آفت آ جائے یا تکلیف دینے والا عذاب نازل ہو۔"

اِس موضوع پر بکثرت آیات و احادیث مذکور ہیں جو اس کا مطالبہ کرتی ہیں کہ بندۂ مومن اس کی فکر و اہتمام کرے کہ امر بالمعروف کے منافع بہت ہیں اور اس سے غفلت یا لاپروائی کے نتائج نہایت ہی بُرے اور خطرناک ہیں۔ اس سلسلے میں کسی کا خوف نہ کرے خواہ کتنا ہی بڑا مرتبہ رکھتا ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولینصرن اللہ من ینصرہ۔ (حج - ۴۰)

"اور جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی مدد ضرور کرتا ہے۔"

دُوسری جگہ ارشاد ہے:

ومن یعتصم باللہ فقد ھدی إلیٰ صراط مستقیم۔

(آل عمران - ۱۰۱)

"اور جس نے خدا کی (ہدایت کی) رسّی کو پکڑ لیا، وہ سیدھے رستے لگ گیا۔"

مزید فرمایا:

والّذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ (روم - ۶۹)

"اور جن لوگوں نے ہمارے لیے کوشش کی، ہم اُن کو ضرور اپنے رستے دکھا دیں گے اور خدا تو نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔"

ایک اور آیت میں اس طرح فرماتا ہے:

ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا

ولیعلمن الکاذبین۔ (عنکبوت - ۳)

"اور جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں ہم نے ان کو بھی آزمایا تھا (اور ان کو بھی آزمائیں گے) سو خدا ان کو ضرور معلوم کرے گا جو (اپنے ایمان میں) سچّے ہیں اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں۔"

یہ نازک ذمّے داری۔ بڑی محنت و جاں فشانی کی متقاضی ہے، مگر اجر بھی

اسی کے حساب سے ہے، اس فریضے کی ادائی میں مداہنت اور چاپلوسی جائز نہیں۔ نہ اس سلسلے میں مخاطب کا خوف یا رشتہ داری کا لحاظ رکھنا ہی درست ہے۔ اس لیے کہ سچائی اور محبت کا یہی تقاضا ہے کہ ان لوگوں کے حق اور رشتے کی ذمّے داری کو ادا کیا جائے، ان کا حق یہی ہے کہ ان کو نصیحت کرے، آخرت کی بھلائی والے کاموں کی طرف بلائے بلکہ محبت اور بھائی چارے کا بھی یہی مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

المؤمنون والمؤمنات بعضہم اولیاء بعض یأمرون بالمعروف و ینھون عن المنکر ویقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ ویطیعون اللہ ورسولہ اولئک سیرحمھم اللہ ان اللہ عزیز حکیم۔ (توبہ - ۷۱)

"اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کرنے کو کہتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے اور نماز پڑھتے، زکوٰۃ دیتے اور خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا رحم کرے گا، بے شک خدا غالب حکمت والا ہے۔"

یہ بات درست ہے کہ اس نازک ذمّے داری کو ادا کرنے میں مشکلات اور دشواریاں ہیں لہٰذا اس کے ذرائع اور وسائل کا مہیّا کرنا اور فضا ہموار کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کے نتیجے میں تشکیل پانے والے اچھے اور صالح معاشرے کو بقا و تسلسل حاصل ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکاۃ وأمروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور" (حج - ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور

زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

آیت کریمہ سے انسان کے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا مفہوم اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے، اور یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ مسلمانوں کی کیا ذمے داریاں ہیں، وہ نماز قائم کرتے ہیں، پورے ارکان و آداب کے ساتھ اس کو ادا کرتے ہیں، مطیع فرمان ہوکر خدا کے سامنے جھکنے اور اظہارِ عاجزی کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں جس کے ذریعے مال کی حرص و لالچ سے پاک ہوجاتے ہیں، شیطانی وسوسے پر غالب آجاتے ہیں، کمزوروں، مسکینوں اور ضرورت مندوں کی کفالت کرتے ہیں، اور اس کی عملی مثال پیش کرتے ہیں کہ مسلمان جسمِ واحد کی طرح ہیں کہ جس طرح جسم کے کسی ایک حصّے کو تکلیف ہوتی ہے تو پورے جسم کو اس کی تکلیف ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے:

"باہم میل محبت، رحمت و شفقت اور لطف و مہربانی میں مسلمانوں کی مثال جسمِ واحد کی طرح ہے کہ جب جسم کے کسی حصّے کو تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم بے خوابی اور بخار کا شکار ہوتا ہے۔"

مسلمان امر بالمعروف کا فریضہ انجام دیتے ہیں، بھلائی اور بہتری کی دعوت دیتے اور لوگوں کو اس پر آمادہ کرتے ہیں، وہ برائی سے روکتے ہیں، ہر طرح کے شر و فساد اور بگاڑ کا مقابلہ کرتے ہیں، اور اپنے اس فریضے کی ادائی کرکے یہ ثابت کردیتے ہیں۔ اس لیے کہ اُمّتِ مسلمہ کی یہ خصوصیت و امتیاز ہے کہ وہ ناپسندیدہ اور منکر باتوں کو بدلنے پر قدرت رکھتے ہوئے برائی پر باقی نہیں رہ سکتی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیل و وضاحت فرمادی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر حالات اور قدرت و صلاحیت کے اعتبار سے کبھی طاقت کے ذریعے ہوگا، کبھی زبان کے ذریعے اور کبھی دل سے بُرا سمجھنے ہی پر اکتفا کرنی پڑے گی۔ دل سے بُرا سمجھنا اور تبدیلی کی فکر کرنا تو ہر مسلمان پر فرض ہے کہ اس میں کسی نقصان کا خدشہ نہیں۔

یہ ایمان کا کمزور ترین اور ادنیٰ درجہ ہے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے بعد رائی کے برابر بھی ایمان کا درجہ باقی نہیں رہ جاتا۔

علماء تشریح فرماتے ہیں کہ طاقت کے ذریعے امر بالمعروف تو حکّام کی ذمے داری ہے اور زبان اور وعظ ونصیحت کے ذریعے امر بالمعروف، یہ علماء کی ذمّہ داری ہے، دل سے بُرا سمجھنا یہ عوام اور کمزوروں کے لیے ہے۔

مسلمانوں کا خواہ وہ مرد ہوں یا عورت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری کو ادا کرنے میں استقامت کا ثبوت دینا ایسا کام ہے کہ اس کی ادائی میں ان کی دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی اور نفع ہے، اس کے ذریعے وہ اپنے رب کی رضا وخوشنودی حاصل کرسکتے ہیں، حدیث شریف میں اس کی تاکید اور اس پر زور کی یہی وجہ ہے، فلیغیرہ بیدہ یعنی عملاً اس کو ختم کرے۔

اس طرح کہ برائی کے آلات کو توڑدے، شراب پھینک دے، کسی کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کرلیا ہے تو اس کو واپس کردے۔

اس سلسلے میں آنے والی آیات واحادیث میں عموم ہے یعنی مردوں اور عورتوں دونوں ہی کو اس کا حکم ہے، دونوں ہی اپنے دائرۂ عمل میں اس فریضے کو انجام دیں گے۔ یہ ایک اصول ہے کہ خطاب عام جو مردوں سے ہوتا ہے، اس میں عام طور پر عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں، سوائے اس کے کہ کسی دلیل کے ذریعے استثنا (الگ) کیا گیا ہو، ایک آیت کریمہ میں تو اس کی باقاعدہ صراحت بھی موجود ہے، ارشادِ ربّانی ہے:

والمومنون والمومنات بعضهم اولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر۔

اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اچھے کام کے کرنے کو کہتے ہیں اور بُری باتوں سے منع کرتے ہیں۔

آیت "کنتم خیر امّۃ" میں لفظ امّت مردوں، عورتوں دونوں کے لیے ہے اس لیے کہ امت مسلمہ دونوں جنسوں سے مل کر بنتی ہے۔ حدیث شریف "من رأی منکم منکراً" میں "من" سے مراد مرد اور عورتیں دونوں ہیں، "من" کا لفظ دونوں کے لیے عام ہے۔

جب سے دعوت کے کام کا آغاز ہوا اسی وقت سے عورتیں اس میں شریک رہی ہیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا دعوت کے کام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مددگار رہیں، جان و مال دونوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرتی تھیں، حضرت عمّار بن یاسر کی والدہ کو ان کے پورے خاندان کے ساتھ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے ستایا جاتا تھا، اللہ کے رسولؐ اس دردناک منظر کو دیکھتے تھے اور یہ فرمانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتے تھے کہ یاسر کے گھر والو! صبر سے کام لو اس کا صلہ جنّت ہے۔ آج کے موجودہ دور میں اس کی کتنی شدید ضرورت ہے کہ امّتِ مسلمہ اپنی عورتوں کو حضرات امّہات المومنین کے اُسوے کو اپنانے اور دعوت کے کام میں شریک ہونے کی تعلیم دے اور اس کی تربیت کرے۔

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ اس حدیث شریف سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دو قسمیں ہیں۔

(الف) ایک قسم میں دعوت کا کام کرنے والے علماء، مصنفین اور مفکرین شامل ہیں۔

(ب) دوسری قسم حکّام کی ہے جو بازاروں، اداروں اور دفاتر کی نگرانی کی ذمہ داری سنبھالے ہوتے ہیں۔ ۲۔ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ منکر کو روکنے کی قدرت و صلاحیت ہوتے ہوئے اس کا روکنا واجب ہے اگر کوئی اس کام کو صرف ملامت کے ڈر سے چھوڑتا ہے اور کسی

نقصان وضرر کا خطرہ نہیں تو وہ ترکِ واجب کا مرتکب ہوگا، اگر ہاتھ یعنی قوت و اقتدار سے نہیں روک سکتا تو زبان سے روکے، یہ بھی نہیں کرسکتا تو دل سے بُرا سمجھے، اس کے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں رہ جاتا۔

٣۔ امام نووی رحؒ کی رائے ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرضِ کفایہ ہے، ان کی دلیل یہ آیت ہے:

ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير ويأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر واولئك هم المفلحون۔

"اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بُلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور بُرے کاموں سے منع کرے یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔"

اگر امّت کے کچھ افراد نے اس فریضے کو ادا کیا تو باقی لوگ مواخذے سے بچ جائیں گے اور اگر کسی نے بھی یہ فرض نہ ادا کیا تو سب گنہ گار رہوں گے۔

٤۔ علماء فرماتے ہیں: جو شخص کسی درجے میں بھی امر بالمعروف کی قدرت و صلاحیت رکھتا ہے محض اس گمان وخیال سے کہ اس کی دعوت سے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا اس سے یہ فریضہ ساقط نہ ہوگا بلکہ اس کو حتی المقدور کوشش کرنا ضروری ہے۔ یہ ذمے داری صرف حکّام کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کو دعوت کا کام کرنے کا حق ہے، علماء تو یہ فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف کا کام کرنے والے کے لیے یہ شرط نہیں کہ وہ خود ہر خامی وکوتاہی سے محفوظ ہو، جس کام کا حکم دے رہا ہے اس پر خود عمل کرتا ہو اور جس بات سے روک رہا ہے اس سے خود بچتا ہو، دعوت کا کام اس پر ضروری ہے خواہ جس بات کا حکم دے رہا ہے یا روک رہا ہے خود اس کا مرتکب ہو۔

٥۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام مکمل طور پر شرعی سزاؤں کے بعد ہی انجام پا سکتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ بادشاہ کے ذریعے وہ کام کراتا ہے جو قرآن کے ذریعے

نہیں کراتا، حکّام پر حدود کا جاری کرنا فرض ہے اور یہ اس وقت ہوسکتا ہے جب فرائض و ذمے داریوں کے چھوڑنے اور حرام کام کرنے پر سزا دی جائے۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ اس حدیثِ پاک سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اس امّت کا شعار ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو خیرِ اُمت کے لقب سے نوازا ہے جس کے ساتھ امر بالمعروف کی شرط لگی ہوئی ہے۔ یہ امر بالمعروف کا راستہ بڑا کٹھن ہے، کانٹوں اور خار دار جھاڑیوں سے پُر ہے۔ جو طاقت ور ایمان اور پاک و صاف دل کا طالب ہے تاکہ داعی اس بوجھ کو اُٹھا سکے، اس راہ کی تکلیفوں کو برداشت کرسکے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب پختہ ایمان ان کا زادِ راہ، تقویٰ ان کی تیاری اور اللہ تعالیٰ ان کا سہارا ہو اور ان کا طریقہ کار و شعار حکمت اور دعوت کا میٹھا اور اچھا انداز ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

> "کسی مسلمان کے لیے زیبا نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے، صحابۂ کرام نے عرض کیا اللہ کے رسول! اپنے کو ذلیل کرنا کس طرح؟ آپ نے فرمایا: اپنے ذمے ایسا کام لے لے جس کو کر نہ سکے۔"

۲۔ حدیث ایسا معاشرہ وجود میں لانے کی دعوت دیتی ہے جو نیکی کو پسند کرتا ہو اور اس کی دعوت دیتا ہو، ناپسندیدہ باتوں کی مخالفت کرتا ہو اور ان سے روکتا ہو، ایسا معاشرہ ہو جو اقدار اور اصولوں پر قائم ہو اس میں مساوات ہو، امیر و غریب، اونچ نیچ کے الگ الگ معیار اور پیمانے نہ ہوں۔

۳۔ دعوت کا کام کرنے والے اور سوجھ بوجھ رکھنے والے نوجوان کارکنوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس پر اچھی طرح غور کرلیں کہ دعوت کے لیے زیادہ کامیاب وسائل و ذرائع کیا ہوسکتے ہیں، جان بوجھ کر اس میں کوتاہی کرنا یہود کی صفات کا مظہر ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بنی اسرائیل میں سب سے پہلے جو کمی پیدا ہوئی، وہ یہ کہ شروع میں جب کوئی کسی ایسے شخص سے ملتا جو برائی کا مرتکب ہوتا تو اس سے کہتا تم خدا سے ڈرو، جو گناہ کر رہے ہو اس کو چھوڑ دو، یہ تمہارے لیے جائز نہیں، پھر دوسرے دن اس سے ملتا تو اس کا یہ عمل اس کو اس کے ساتھ کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے سے باز نہیں رکھتا تھا۔ جب انھوں نے ایسا چلن اپنایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر پھوٹ ڈال دی۔"

پھر آپؐ نے فرمایا:

لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان داؤد و عیسٰی بن مریم ذٰلک بما عصوا و کانوا یعتدون کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون۔ (مائدہ - ۷۱ - ۷۵)

"جو لوگ بنی اسرائیل میں کافر ہوئے ان پر داؤدؑ اور عیسٰی بن مریمؑ کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس لیے کہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے (اور) برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے کو روکتے نہیں تھے، بلاشبہ برا کرتے تھے۔"

۴۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم یا سمع کے بجائے لفظ 'رأی' استعمال فرمایا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ داعی پہلے یہ یقین کرلے کہ یہ بات تمام علماء کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، اس میں اختلاف کی گنجایش نہیں ہے جس بات میں اختلاف ہو فتنہ و ہنگامہ سے بچنے کے خیال سے اس میں تبدیلی نہیں کرنا چاہیے۔

٦

توحیدِ رب کا تقاضا تو یہ ہے

"عن ابن عباس قال کنت خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوماً فقال: یا غلام، إنی أعلمك کلمات: احفظ اللہ یحفظك احفظ اللہ تجدہ تجاهك، اذا سألت فاسأل اللہ، وإذا استعنت فاستعن باللہ، واعلم أن الأمة لو اجتمعت علی أن ینفعوك بشیٔ لم ینفعوك إلا بشیٔ قد کتبہ اللہ لك، وان اجتمعوا علی أن یضروك بشیٔ لم یضروك إلا بشیٔ قد کتبہ اللہ علیك، رفعت الأقلام وجفت الصحف"۔ (ترمذی)

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہی سواری پر آپؐ کے پیچھے سوار تھا کہ آپؐ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"اے لڑکے تو اللہ تعالیٰ کا خیال رکھ۔ یعنی اس کے احکام کی تعمیل اور اس کے حقوق کی ادائی سے غافل نہ ہو اللہ تعالیٰ تیرا خیال فرمائے گا اور دنیا و آخرت کی بلاؤں سے تیری حفاظت کرے گا، تو اللہ کو یاد رکھ جیسا کہ یاد رکھنا چاہیے۔ اس کو تو اپنے سامنے پائے گا اور جب تو کسی چیز کو مانگنا چاہے تو بس اللہ سے مانگ اور جب کسی ضرورت اور مہم میں مدد کا محتاج اور طالب ہو تو اللہ ہی سے امداد و اعانت

طلب کر اور اس بات کو دل میں بٹھا لے کہ اگر ساری انسانی برادری بھی باہم متفق ہو کر اور جُڑ کر چاہے کہ تجھ کو کسی چیز سے نفع پہنچائے، تو صرف اس چیز سے تجھ کو نفع پہنچا سکے گی جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے مقدر کر دی ہے — اس کے سوا کسی چیز سے نہیں — اور اسی طرح اگر ساری انسانی دنیا تجھ کو کسی چیز سے نقصان پہنچانا چاہے تو صرف اسی چیز سے نقصان پہنچا سکے گی، جس سے نقصان پہنچنا اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے تیرے لیے مقدر کر دیا ہے، اس کے سوا کسی چیز سے تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جا سکے گا — اُٹھ چکے قلم اور خشک ہو چکے صحیفے۔

(مسند احمد و جامع ترمذی)

اس حدیث پاک میں مسئلہ توحید اور بندے کے اللہ اور اس کی ذاتِ عالی سے ربط و تعلق پیدا کرنے پر زور دیا گیا ہے — اس حدیث کا پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ اس کے الفاظ دل پر توحید رب کا ایک ہالہ بنا دیتے ہیں جو دل کے تاروں پر پیہم ضرب لگاتا ہے اور مسلمان کے دل میں توحید اور تعلق مع اللہ کا مؤثر و کامیاب راگ پیدا کر دیتا ہے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے " تو اللہ تعالیٰ کا خیال رکھ، اللہ تعالیٰ تیرا خیال فرمائے گا" کے الفاظ سے اس حدیث کو شروع فرمایا ہے یعنی تو اللہ تعالیٰ کے حکموں کا خیال اور دھیان رکھ اس میں ادنیٰ کوتاہی نہ کر اور جن باتوں سے اللہ نے منع فرمایا ہے، ان کے نزدیک نہ پھٹک، چوکنّا اور ہوشیار رہ کہ شیطان ان باتوں کو جن سے تجھ کو روکا گیا ہے، ان کو تیری نظروں میں خوب صورت بنا کر کہیں تجھ کو ان میں پھنسا نہ دے، لوگوں کو بھی اس کی فکر رکھنے کی دعوت دے، اگر تو نے ایسا کر لیا تو اللہ تعالیٰ تجھ کو تمام مصائب و آفات سے محفوظ رکھے گا۔

پھر اللہ کے رسولؐ فرماتے ہیں: "تو اللہ کو یاد رکھ جیسا کہ یاد رکھنا چاہیے اس کو تو اپنے سامنے پائے گا۔"

"طیبی"، تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ حقوق اللہ کا پورا خیال رکھو اس کی رضا کو ہر کام میں پیش نظر رکھو، اللہ تعالیٰ کو اپنے روبرو یعنی محافظ اور مددگار پاؤ گے"۔ اس لیے کہ عمل کا بدلا بھی ویسا ہی ملتا ہے جیسا عمل ہوتا ہے، چناں چہ فرمایا:

"أوفوا بعهدی أوف بعهدکم"

اس اقرار کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا میں اس اقرار کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا۔

اور فرمایا:

"فاذکرونی أذکرکم۔"

سو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔

ایک اور آیت میں فرمایا:

"إن تنصروا اللہ ینصرکم۔"

اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کی حفاظت کی دو صورتیں ہیں

دنیوی حفاظت مثلاً جان، مال، اولاد وغیرہ کی حفاظت جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"له معقبات من بین یدیه ومن خلفه یحفظونه من أمر اللہ۔"

اس کے آگے اور پیچھے خدا کے چوکیدار ہیں جو خدا کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مقرر فرما رکھا ہے جو اس کے حکم سے بندے کی حفاظت فرماتے رہتے ہیں لیکن جب تقدیر کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے تو فرشتے ہٹ جاتے ہیں۔

۲- اور یہ دونوں صورتوں میں سے بہتر صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کے دین و ایمان کی حفاظت فرماتا ہے، زندگی میں گمراہ کن شبہات اور حرام خواہشوں سے بچاتا ہے اور موت کے وقت دین کی حفاظت فرماتا ہے اس طرح کہ بندے کا ایمان پہ خاتمہ فرماتا ہے۔

اس کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ بیان فرماتے ہیں کہ بندہ جب اللہ سے مانگے اور مدد طلب کرے تو کیا مانگنا چاہیے، چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "مانگنا ہو تو اللہ سے مانگو اور مدد طلب کرو تو اللہ سے۔" اللہ تعالیٰ سے مانگنا ہی دعا اور اس سے محبت کی علامت ہے۔ دعا عبادت ہے۔ ترمذی شریف میں حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے، اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کے طلب گار بنو! اللہ تعالیٰ مانگنے اور سوال کرنے کو پسند فرماتا ہے۔ ترمذی ہی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے "جو شخص اللہ تعالیٰ سے دعا اور سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر غصہ ہوتا ہے۔" اس طرح کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں جو اس آیت کریمہ کے مفہوم پر مشتمل ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وإذا سألك عبادي عني فإني قريب أجيب دعوة الداع إذا دعان۔" (بقرہ - ۱۸۶)

اور (اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں، جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔

یہ وہ آیت پاک ہے جو بندۂ مومن کے دل میں انس و محبت، اطمینان بخش

خوشنودی اور اعتماد و یقین کی شبنم افشانی کرتی ہے، بندۂ مومن اس آیت کے سائبان میں رہ کر من پسند چمنستان کی بہاروں میں زندگی گزارتا ہے۔ اسی غیر معمولی پیار اور محبت کے سائے میں اللہ اپنے بندوں کو مانگنے اور دعا کرنے کی طرف متوجہ کرتا ہے، فرماتا ہے:

" فلیستجیبوالی ولیومنوابی "

ان کو چاہیے کہ میرے کلموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

" وقال ربکم ادعونی أستجب لکم۔"

تم مجھ سے دُعا کرو میں تمہاری (دُعا) قبول کروں گا۔

صحیحین میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے (بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ہے کوئی دعا کرنے والا کہ اس کی دُعا قبول کروں، ہے کوئی مانگنے والا کہ اس کی مانگ پوری کروں، ہے کوئی گناہوں سے معافی مانگنے والا کہ اس کو معاف کروں)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب ..... "جب مدد طلب کرو تو اللہ تعالیٰ ہی سے طلب کرو۔" یہ ہے کہ صرف اللہ ہی کی ذات سے مدد مانگی جائے اس لیے کہ اس کے علاوہ کوئی بھی دینے نہ دینے، نقصان دُور کرنے یا نفع پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا، مدد اسی سے طلب کی جاتی ہے اور بھروسے کے قابل وہی ہے۔

دنیا کی زندگی میں بندہ اللہ تعالیٰ کے حکموں پر عمل کرنے اور منع کی ہوئی باتوں سے بچنے اور تقدیر کے فیصلوں پر صبر کی توفیق ملنے میں خدا ہی کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ سو جو شخص ان چیزوں میں اپنے کو مدد کا مستحق بنا لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے۔ حدیث صحیح میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، ایسی چیز

کے خواہش مند بنو جو تمہارے لیے نفع بخش ہو اور اس سلسلے میں مدد اللہ تعالیٰ سے مانگو اور کمزور و بے حیلہ نہ بنو۔ جس نے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا چھوڑ دیا اور غیر اللہ سے مدد مانگی تو اللہ تعالیٰ اس کو اسی کے حوالے کر دیتا ہے جس سے اس نے مدد مانگی ہے، چناں چہ وہ بے سہارا ہو کر رہ جاتا ہے، دینے والا اور روکنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، وہ سب سے بے نیاز اور مخلوق ساری کی ساری اسی کی محتاج ہے۔

اس کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن عباسؓ سے فرماتے ہیں "اس بات کو دل میں بٹھالے کہ اگر ساری انسانی برادری بھی باہم متفق ہو کر اور جڑ کر چاہے کہ تجھ کو کسی چیز سے نفع پہنچائے تو صرف اسی چیز سے تجھ کو نفع پہنچا سکے گی جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے مقدر کر دی ہے اس کے سوا کسی چیز سے نہیں۔ اور اسی طرح اگر ساری انسانی برادری تجھ کو کسی چیز سے نقصان پہنچانا چاہے تو صرف اسی چیز سے نقصان پہنچا سکے گی جس سے نقصان پہنچنا اللہ تعالیٰ نے پہلے سے ہی تیرے لیے مقدر کر دیا ہے اس کے سوا کسی چیز سے تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ بندے کو دنیا میں جو بھی تکلیف اور نقصان یا نفع اور آرام پہنچتا ہے وہ اس کے لیے پہلے سے مقدر ہو چکا ہے یہ بات قرآن کریم کی متعدد آیات سے معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" قل لن یصیبنا إلّا ما کتب اللہ لنا۔"

کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز اس کے کہ جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دی ہو۔

دوسری آیت میں فرمایا:

ما أصاب من مصیبۃ فی الأرض ولا فی أنفسکم إلا فی کتاب من قبل أن نبرأھا۔

کوئی مصیبت ملک پر اور خود تم پر نہیں پڑتی مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔

جس دل میں توحید کا چراغ روشن ہوتا ہے اس کو یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کو وہی اچھائی اور برائی، نفع اور نقصان پہنچ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے لکھ دیا ہے وہ اپنے گردوپیش کی ہر شے میں خدا کی قدرت کو جلوہ گر دیکھتا ہے لہٰذا اس پر راضی و مطمئن رہتا ہے۔

حدیث عقیدۂ توحید کی تاکید و وضاحت پر اس طرح ختم ہوتی ہے "اٹھا لیے گئے قلم اور سوکھ چکے صحیفے"۔

یعنی تقدیر لوح محفوظ میں لکھی جا چکی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں وہ طریقۂ زندگی واضح فرما دیا ہے جسے بندے کو اپنی زندگی میں اپنانا چاہیے۔ وہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرے، جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے ان کی ادائی میں کوتاہی نہ کرے اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے ان کے قریب نہ پھٹکے اور دعا اور مدد صرف خدا ہی سے مانگے، اور نفع و نقصان جو بھی پیش آئے اس کو خوشی سے گوارا کرلے۔ یہ ہے توحید کی اصل روح۔

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا اللہ کے سوا کسی اور کا واسطہ دے کر نہ کرنا چاہیے۔ میں اس کو ناپسند کرتا ہوں کہ کوئی شخص تیرے عرش کے جاہ کی قسم یا بجاہ خلقك کہے۔ امام قدوری فرماتے ہیں بجاہ خلقك کہہ کر دعا کرنا جائز نہیں اس لیے کہ یہ متفق علیہ مسئلہ ہے کہ مخلوق کا خالق پر وجوبی حق نہیں ہے۔

۲۔ امام ابوحنیفہؒ نے جو یہ فرمایا کہ اللہ سے اس کی مخلوق کے واسطے سے نہ مانگا جائے، دو مفہوم رکھتا ہے ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ پر اس کی مخلوق کے ذریعے

قسم دی جائے اور یہ تمام علماء کے نزدیک ممنوع ہے، دوسرا مفہوم یہ کہ اس سے قسم کے ذریعے سوال کیا جائے یہ ایک جماعت کے نزدیک جائز ہے اور اس سلسلے میں بعض سلف کے اقوال بھی ملتے ہیں۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ اس حدیث پاک کے الفاظ دل میں ایک جھرجھری اور حرکت پیدا کر دیتے ہیں کہ اس میں عقیدۂ توحید جم جائے اور شرک کے تمام قسم کے شبہات دور ہو جائیں، لوح دل پر توحید کے اثرات پڑتے رہتے ہیں۔ کبھی نفس عبارت والفاظ سے کبھی اس کے معانی ومفاہیم سے۔

۲۔ جس دل میں حدیث پاک سما جاتی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کو وہی خیر اور بھلائی یا مصیبت اور پریشانی پہنچ سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے لکھ دیا اور مقدر فرما دیا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے قرب وتعلق کی فضا میں رہتا ہے اور اس کے ہر خیال وعمل اور سلوک وبرتاؤ میں توحید جلوہ گر نظر آتی ہے۔

۳۔ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ یقین وعقیدہ رکھے اور اس پر مطمئن وقانع رہے کہ اس کے ساتھ جو حالات پیش آتے ہیں اچھے یا بُرے، روزِ آفرینش ہی سے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقدر فرما دیا ہے۔ کوئی بھی اس میں نہ تبدیلی کر سکتا ہے اور نہ اس سے اس کو دُور کر سکتا ہے تو پھر انسان کسی انسان سے کیوں اُمیدیں لگائے۔

۷

باہمی میل محبت کمالِ ایمان کی علامت ہے

"عن أنسؓ عن النّبی صلی اللہ علیہ وسلّم قال: لا یُؤمِنُ أَحَدُکُمْ حتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیہِ مَا یُحِبُّ لنفسہ" (بخاری)

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں میں باہمی محبت وتعلق اور بھائی چارے کے جذبات کو نہایت خوب صورت انداز اور آسان ومختصر الفاظ میں جس طرح بٹھاتا اور اُتارنا چاہتے تھے، یہ حدیث اس کی نہایت شاندار مثال ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار میں باہمی بھائی چارہ اور مساوات ومواخات کی فضا استوار کرکے اجتماعی ومعاشرتی زندگی کے اصول کی ایک بنیاد قائم کردی تھی اور اس کے ذریعے مساوات کی تعلیم کو عملی طور پر نافذ کرکے اور اونچ نیچ کے فرق کو مٹا کر رنگ ونسل کے تعصب کا خاتمہ فرمادیا تھا۔ یہ گویا ایمان کی حقیقت اور اس کے درجۂ حرارت کو ناپنے کا ایک پیمانہ قرار پایا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"إِنَّمَا المؤمِنُونَ إِخْوَۃٌ۔"

مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

قرآن کریم مسلمانوں میں اخوت وبھائی چارہ اور باہم ایک دوسرے کی مدد ونصرت پہ جگہ جگہ زور دیتا ہے اور ایک مسلمان دینی یا دنیوی جس اعتبار سے بھی مدد

کا محتاج و ضرورت مند ہو، جان، مال اور زبان ہر طرح سے اس کی مدد کی دعوت و ترغیب دیتا ہے۔ فرمایا:

"والمؤمنون والمومنات بعضھم اولیاءُ بعض"

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

"وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر الا علی قوم بینکم وبینھم میثاق" (التوبہ - ۷۲)

اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔

یہ آیات قرآنی اخوت اور بھائی چارے کے دور رس اثرات اور مقاصد کو بتاتی ہیں، اس اخوت اسلامی کے بہت واضح اور کھلے ہوئے معانی وہ ہیں جس کو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بلیغ وحکیمانہ اسلوب میں اس حدیث پاک (تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے) میں بہت صاف صاف بیان فرمادیا ہے، اس لیے کہ دوستی ہمت وشجاعت، باہمی مدد وتعاون اور ادائے فرض کی متقاضی ہوتی ہے، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایمان کا یہ مفہوم ہر بندۂ مومن میں نہ پایا جائے۔

علماء فرماتے ہیں کہ لا یؤمن کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان مومنِ کامل اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک اس میں یہ صفت نہ پائی جائے؛ اس لیے کہ اصل ایمان تو اس میں بھی پایا جائے گا جو ان صفات کا حامل نہ ہو اور اپنے بھائی کے لیے پسند کرنے کا مطلب نیک کام، طاعت وعبادت اور مباح چیزیں ہیں،

جس کا ثبوت نسائی کی اس روایت سے ملتا ہے :

"یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی اچھائی اور بھلائی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے"۔

خیر ایسا جامع لفظ ہے جو اطاعت و انقیاد اور دُنیا و آخرت سے متعلق مباحات سب پر مشتمل ہے ۔ شریعت کے اندر ممنوع اور ناپسندیدہ چیزیں اس سے خارج ہیں، اس لیے کہ خیر کے لفظ میں یہ چیزیں نہیں آسکتی ہیں اور جذباتِ محبت خیر ہی چاہتے ہیں ۔ اس لیے کہ مؤمن کا ذوق و مزاج ہی اُمّت مسلمہ کا ذوق و مزاج ہے، اتحاد اور ایک دوسرے کی فکر و مدد کا مزاج ہے، باہم میل میلاپ کا مزاج ہے، وہ میل ملاپ جو بھلائی کا پرچار کرتا ہے اور بُرائی اور فساد کو ختم کرتا ہے ۔۔

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے خیر و بہتری والی چیزیں نہ پسند کرے"۔

اور یہ پسند و محبت دوستی، قربانی اور باہمی تعاون کی متقاضی ہے تاکہ اُمّت مسلمہ ایک صف میں کھڑی ہو جائے اس کی صفوں میں جُدائی اور علاحدگی پسندی کے محرکات نہ داخل ہونے پائیں، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اس دوستی ہی کی طاقت سے وہ نیکی اور بھلائی کو پھیلانے کے کام میں لگتے ہیں اور اس اُمّت کے لیے نازل ہونے والے احکام کو عملی جامہ پہنانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہ بندۂ مومن کی تربیت کا حکیمانہ انداز ہے، تاکہ دل کا ہر خیال، زندگی کے تمام حرکات و سکنات ایمان کے اصولوں سے جُڑ جائیں اور اخوت کے بندھن میں بندھ جائیں، اور تمام میلانات و رجحانات، شعور و احساسات، خواہشیں اور مرغوبات، کتاب و سنّت کے سانچے میں ڈھل جائیں ۔ مسلمان لوگوں سے ملے تو اللہ ہی کے لیے، کسی سے محبت کرے تو اللہ ہی کے لیے ۔ مسلمانوں کے اجتماعی و معاشرتی تعلقات کی اساس و بنیاد اللہ کے مقام کا پاس و لحاظ اور باہمی اُخوت و محبت ہو، لیکن ہے یہ ذرا مشکل

کام جو نہ بروقت عت اور حلم و بُردباری کا متقاضی ہے؛ نہیں مؤمن ہوسکتا یعنی کوئی شخص حقیقی ایمان کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا، اس نفی سے مُراد کمال ایمان کی نفی ہے نہ کہ مطلق ایمان کی، جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی مسلمان میں یہ صفات نہ پائی گئیں تو وہ کافر نہیں ہوجائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بھائی چارہ اور باہمی میل محبت آج کے مادہ پرستانہ ماحول وفضا میں ایک مثالی تجربہ تھا جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دلوں کو جوڑنے اور ایک معاشرہ قائم کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ بنایا تھا، جس میں محبت اور میل ملاپ کی بہار تھی — یہ معاشرتی تعلقات کو منظم کرنے کی مبارک پہل تھی — حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب مہاجرین مدینہ آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت سعد بن الربیعؓ میں بھائی چارہ کرایا تو حضرت سعد نے حضرت عبدالرحمٰن سے کہا:

> ”حضرات انصار میں ہمارے پاس سب سے زیادہ مال ہے ہم اپنا مال تم کو آدھے بانٹ دیتے ہیں، ہماری دو بیویاں ہیں جو تم کو پسند ہو بتادو میں اسے طلاق دے دوں، پھر عدت گزر جائے تو تم اس سے شادی کرلو۔“

یہ سُن کر حضرت عبدالرحمٰنؓ نے فرمایا:

> ”اللہ تعالیٰ آپ کے اہل وعیال اور مال ومنال میں برکت دے، یہ آپ کو مبارک ہو، مجھے تو اپنے یہاں کے بازار کا راستہ بتا دیجیے، ان لوگوں نے بنو قینقاع کے بازار کا راستہ بتادیا، وہ بازار گئے، وہاں کچھ خرید و فروخت کی اور گھی اور پنیر لے کر واپس آئے۔“

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی یہ حوصلہ مندی اور جود و سخا، حدیث پاک کی عملی مثال تھی اور حضرت عبدالرحمٰن کا جواب شرف وبلندی کی آخری مثال کا نمونہ تھا، جس میں اخوت ومروّت کی تصویر نظر آرہی تھی، مقصد کی وہ بلندی اور اخوت کی وہ حقیقت

جس کی مثال پر ان کی تربیت ہوئی تھی اور اس شاندار نمونے نے جس نے ان صفات کی طرف ان کی رہنمائی کی اس نے ان کے اندر فضل و شرف کا بیج بو دیا تھا — یہ وہی ایمانی اخوت تھی جس کے بارے میں اللہ کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :-

"ایمان والوں کو ان کی آپس کی شفقت، محبت و الفت اور ہمدردی میں ایک جسم جیسا پاؤ گے کہ اگر اس کے کسی عضو میں تکلیف ہو تو سارے اعضاء جسم باقی تپ اور بے خوابی میں اس کا ساتھ دیتے ہیں"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف مناسبتوں سے اخوت اور بھائی چارے کے اس جذبے کو تازہ فرماتے رہے تا کہ مسلمان آپس میں جُڑیں اور باہم برادرانہ تعلقات قائم ہوں، وہ گھر میں ہوں کہ مسجد میں، بازار میں ہوں کہ میدانِ کارزار میں، جہاں کہیں بھی ہوں یہ اخوت ان کا ساتھ نہ چھوڑے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ ہے جو ان تمام باتوں کو چھوڑ دے، جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔"

اللہ کے واسطے بھائی چارہ اور برادرانہ تعلقات کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے جذبات و احساسات کا خیال رکھے، ہر ایسے کام سے بچے جس سے باہم اختلاف پیدا ہوتا ہو اور پھوٹ پڑتی ہو اور اس چیز سے دُور رہے جو دلوں میں غیظ و غضب پیدا کرتی ہو، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد جگہ مسلمان کو اس کے بھائی کے لیے نفس کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے یعنی ایک جان دو قالب فرمایا (فلا تزکوا أنفسکم)،

"تم اپنے کو پاک صاف نہ جتاؤ"

دُوسری جگہ فرمایا :

لقد جاءکم رسول من انفسکم۔
'لوگو! تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں'
ایک اور آیت میں فرمایا:
فسلموا علیٰ أنفسکم۔
'تو اپنے گھر والوں کو سلام کیا کرو'
ایک جگہ فرمایا:
فلا تقتلوا أنفسکم۔
'اور اپنے آپ کو ہلاک مت کرو'
حتیٰ کہ قصاص تک کے موقع پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
'فَمَن عُفِیَ لَہٗ مِنْ أخیہ شیءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالمعرُوفِ وَ اَدَاءٌ
اِلیہِ بِاِحْسَانٍ۔
'اور اگر قاتل کو اس کے (مقتول) بھائی (کے قصاص میں) سے کچھ معاف کر دیا جائے تو (وارث مقتول کو) پسندیدہ طریقہ سے (قرار داد کی) پیروی یعنی مطالبۂ خوں بہا کرنا اور (قاتل کو) خوشی کے ساتھ ادا کرنا چاہیے'

بندۂ مومن جب اللہ تعالیٰ سے لَو لگاتا ہے، اور اس کی عبادت کرتا ہے اور اس کے حکموں پر چلتا ہے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ اس کو وہی چیز پسند آتی ہے جو خدا کو پسند ہو اور ہر وہ چیز جس سے اللہ تعالیٰ ناخوش و ناراض ہوتا ہے' یہ بندہ بھی اس سے ناراض و خفا ہوتا ہے۔ جس کو دیتا ہے خدا کے لیے، جس سے روکتا ہے خدا ہی کے خوف سے، یہی وہ بندۂ مومن ہے، جس کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو بندہ اللہ ہی کے لیے محبت کرے، اللہ ہی کے لیے ناراض و خفا ہو، اللہ ہی کے لیے دے اور اسی کے خوف سے روکے تو اس نے

اپنے ایمان کو کامل بنالیا۔ اس بندہ کا پورا دین اللہ کے لیے ہوگیا اور اس نے اطاعت و عبادت کا حق ادا کردیا۔

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ بھائی چارے کا تقاضا یہ ہے کہ بیمار کی عیادت کی جائے، جنازے کے ساتھ قبرستان جایا جائے، چھینکنے والے کی چھینک پر یرحمک اللہ کہا جائے، سلام کا جواب دیا جائے، مظلوم کی مدد کی جائے، قسم کھانے والے کی قسم کو پورا کیا جائے، اگر کوئی دعوت کردے تو قبول کی جائے۔

۲۔ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس کی محبت و ناراضی، دوستی اور دشمنی خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے احکامات کی خاطر ہو۔

۳۔ دینی رشتے کے بھائی کے مال میں وراثت نہیں ہوگی، اس لیے کہ یہ منسوخ ہوچکی ہے لیکن اگر دونوں بہ طیب خاطر ایک دوسرے کے مال میں تصرف سے خوش ہیں تو یہ درست ہوگا جیسا کہ اسلاف کیا کرتے تھے۔

۴۔ غائبانہ طور پر اپنے مسلمان بھائی کے لیے دعا کرنے کا حکم ہے۔

۵۔ بھائی چارے کا تقاضا ہے کہ جو چیز خود کو ناپسند ہے اس کو اپنے بھائی کے لیے بھی ناپسند کرے۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ اس حدیثِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی بھائی چارہ اللہ کے واسطے باہمی ربط و تعلق ہے جو مسلم معاشرے کے افراد کو باہم جوڑتا ہے اور آپس میں حسنِ سلوک کے تعلق کو مضبوط بناتا ہے — یہ معاشرے کی تعمیر کا کامیاب وسیلہ ہے، جن لوگوں

کے تعلقات، محبت و ناراضی اور دوستی، دین و ایمان اور اطاعتِ خداوندی کی بنیاد پر نہیں قائم ہیں ان کے ایمان کامل نہیں۔

۲۔ بھائی چارے کا اظہار، مسلمان کے احترام، اس کے حقوق کی رعایت، اس کی آبرو ریزی سے پرہیز، اس کی عزت، اس سے محبت اور ہر نیک کام میں اس کے ساتھ تعاون کی شکل میں ہونا چاہیے۔

۸

بندۂ مومن کی پریشانی دور کرنے کا صلہ آخرت ہے

عن أبی ہریرۃؓ عن النبیؐ قال: من نفس عن مومن کربۃ من کرب الدنیا نفس اللہ عنہ کربۃ من کرب یوم القیامۃ، ومن یسر علی معسر یسر اللہ علیہ فی الدنیا والآخرۃ. ومن ستر مسلماً سترہ اللہ فی الدنیا والآخرۃ۔ واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون أخیہ، ومن سلک طریقاً یلتمس فیہ علماً سہّل اللہ بہ طریقاً الی الجنۃ، وما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللہ تعالیٰ یتلون کتاب اللہ ویتدارسونہ بینھم إلا نزلت علیھم السکینۃ، وغشیتھم الرحمۃ، وحفتھم الملائکۃ، وذکرھم اللہ فیمن عندہٗ ومن بطّأ بہ عملہ لم یسرع بہ نسبہ۔ (رواہ مسلم)

”حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو کسی مومن کی دُنیوی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت دُور کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی آخرت کی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت دُور کرے گا ——
اور جو کسی مشکل والے کی مشکل آسان کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی مشکل دنیا اور آخرت میں آسان کرے گا اور جو مسلمان کی ستر پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی ستر پوشی فرمائے گا اور جو اپنے بھائی کی مدد میں ہوگا اللہ تعالیٰ اس کی مدد میں ہوگا اور جو علم کی تلاش میں راستہ طے کرے گا

اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرمائے گا اور جو لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر یعنی مسجد میں جمع ہوں گے اور اللہ کی کتاب پڑھیں گے اور آپس میں سُنائیں گے تو ان کے دلوں پر تسکین اُترے گی اور رحمت ان کو ڈھانپ لے گی اور فرشتے ان کو گھیر لیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے پاس والوں پر ان کا ذکر فرمائے گا اور جو اپنے عمل میں سُستی کرے گا تو اس کو اس کا نسب نہیں بڑھا سکتا۔

یہ حدیث ایمان کی عملی تصویر کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے اور باہم بھائی چارے کا حسین و دل آویز مفہوم سامنے لاکر اخوت کے روشن ترین نقوش کا آئینہ دکھاتی ہے اور ایک ایسے ماحول کو وجود بخشنے میں مدد کرتی ہے جو میل جول کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے، یہ حدیث ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی داغ بیل ڈالتی ہے، جس میں مسلمان اپنے دینی بھائیوں کی مدد کا شائق ہوتا ہے ان کی دشواریوں کو آسان بناتا ہے، مصیبتوں کو دُور کرتا ہے، راحت و مصیبت، خوشی اور غمی ہر حال میں اس کا شریک حال ہوتا ہے۔ یہ پوری حدیث دنیا میں انسان کے عمل اور آخرت میں اس عمل کے صلہ و جزاء کو آمنے سامنے کرکے بیان کر دیتی ہے۔ امام نوویؒ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث نہایت عظیم الشان ہے۔ یہ حدیث کئی طرح کے علوم، اصول اور آداب کی جامع ہے، حدیث کی ابتدا مَنْ نَفَّسَ کے لفظ سے ہوئی ہے۔

مصیبت دُور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے اس بندے کو چھٹکارا دلا دیا، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ضرورت پوری کردینے، حتی المقدور ان کو فائدہ پہنچانے کی کیا فضیلت ہے خواہ یہ مدد اپنے علم و واقفیت کے ذریعے ہو یا مالی اور اخلاقی تعاون وغیرہ کے ذریعے ہو۔

حدیث میں "جو مسلمان کی ستر پوشی کرے گا" ستر پوشی کا مطلب یہ ہے کہ اس کی لغزشوں اور بھول چوک سے ہو جانے والی غلطیوں کو لوگوں سے چھپائے ان کو ہر

جگہ بیان نہ کرتا پھرے، ہاں اگر کسی بڑے گناہ میں اس کو مبتلا دیکھے تو اس پر بے تکلف ناگواری ظاہر کرے اور اس کو اس گناہ سے روکے، اور اگر ایسا کرنے پر قادر نہ ہو تو موقع و مصلحت کی رعایت کرتے ہوئے حاکم وقت کو مطلع کرے، کیوں کہ ایسے جرم وخطا سے ستر پوشی اس شخص کے اندر فساد اور بگاڑ، ایذا رسانی اور لوگوں کی پردہ دری کے عیب کو برابر بڑھاتی جائے گی اس کو دیکھ کر دوسروں میں بھی ان جرموں کے ارتکاب کی ہمت و جرأت پیدا ہوگی۔

"جو اپنے بھائی کی مدد میں ہوگا اللہ تعالیٰ اس کی مدد میں ہوگا" حدیث پاک کا یہ جملہ بندۂ مومن کے اندر مال و دولت، اپنا وقت اور کدو کاوش سبھی کچھ اپنے بھائی کے لیے لگا دینے کا جذبہ اور حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اس لیے کہ بندۂ مومن یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل اور جذبے کو دیکھ رہا ہے، لہٰذا وہ بہتر سے بہتر ایثار و قربانی دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا — حدیث کا ایک کھلا ہوا مفہوم یہ بھی ہے کہ جب اپنے بھائی کی مدد کا ارادہ کرے تو حق بات کو کھل کر بیان کرنے میں بزدلی کا مظاہرہ نہ کرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خود اس کی مدد میں ہے۔

حدیث شریف باہم ربط و تعلق، بھائی چارہ، ایک جگہ جمع ہونے کی فضیلت کو بتاتی ہے، اور اس کا مرکزی نکتہ اجتماعی طور پر قرآن کریم کی تلاوت اور سیکھنا سکھانا ہے، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ کسی مسلمان معاشرے میں جب کچھ لوگ مسجد میں تلاوتِ کلام پاک کی غرض سے جمع ہوتے ہیں، اس کے مفہوم و معانی پر غور و فکر کرتے ہیں۔ آیات کے مفہوم و معانی کا باہم مذاکرہ کرتے ہیں، ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں، جمع ہونے والوں کے مقاصد میں جب یہ چیزیں پائی جاتی ہیں تو اس کا سب سے پہلا صلہ تو یہ ملتا ہے کہ ان پر سکینہ اور اطمینان کا نزول ہوتا ہے، وقار و تمکنت ان پر سایہ فگن ہو جاتا ہے، دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت چھا جاتی ہے، تیسرے یہ کہ ان پر رحمت خداوندی کا ایسا نزول ہوتا ہے کہ

وہ ان پر ایک سائبان کی طرح سایہ فگن ہو جاتی ہے، چوتھی یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کا تذکرہ اپنی بارگاہ میں حاضر فرشتوں سے بطور پسندیدگی اور اعزاز و تکریم کے فرماتا ہے۔

اس طرح عمل ہی جیسا بدلا بھی ملتا ہے اور مقصد قبول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس جو صلہ اور بدلا ہے وہ سب سے بہتر اور دائمی ہے، اللہ تعالیٰ نیکوں کے اجر کو رائگاں نہیں فرماتا۔

حدیث کا فقہی پہلو

جب قرض خواہ کو قرض دار کی تنگ حالی کا علم ہو جائے یا اس کو یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ نادار ہے تو پھر اس سے تقاضا کرنا درست نہیں اگرچہ حاکم کے پاس عدالت میں دلائل و بیان سے اس کی تنگی پائے ثبوت کو نہ پہنچ سکے۔

تنگ حال قرض دار کے ساتھ سہولت و آسانی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اس کو اس وقت تک مہلت دی جائے جب تک مال دار نہ ہو جائے۔

موجودہ حالات اور حدیث

حدیث پاک کی رو سے مسلمانوں کی ستر پوشی یعنی ان کے عیوب کو چھپانا لازم ہے۔ صحابۂ کرام کا یہ حال تھا کہ اپنے بھائیوں کے حالات معلوم کرتے رہتے اور ان کے معاملات میں سہولت بہم پہنچانے کے بڑے شائق رہتے تھے۔

حضرت ابو قتادہؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنے قرض دار کو ڈھونڈا تو وہ چھپ گیا پھر بعد میں جب ملا تو اس نے اپنی تنگ حالی کا عذر پیش کیا، حضرت ابو قتادہؓ نے پوچھا کیا سچ کہتے ہو؟ اس نے کہا، ہاں میں سچ کہتا ہوں۔ تو حضرت ابو قتادہؓ نے فرمایا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے "جس کو اس بات سے خوشی

ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کی مصیبتوں سے نجات دے تو اس کو چاہیے کہ تنگ حال قرض دار کو مہلت دے یا سرے سے قرض ہی معاف کر دے۔"

یہ حدیث اخوت اور برادرانہ برتاؤ کی عملی تطبیق اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ پاک کو عملی طور پر پیش کرنے کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس وقت کے موجودہ حالات و ماحول میں ہمیں اس طریقے کو اپنانے کی کتنی شدید ضرورت ہے۔

حدیثِ پاک حصول علم پر زور دیتی ہے اور اس کی تاکید کرتی ہے اس طرح کہ چشمۂ علم سے سیراب ہونے کے لیے برابر کوشاں رہنا چاہیے۔ خانۂ خدا میں جمع ہو کر تلاوتِ کلامِ پاک کی فضیلت کو واضح کرتی ہے اور اس کا شوق دلاتی ہے۔

۹

مسلم معاشرے کا امتیازی نشان

ارشادِ ربّانی ہے:

"یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوْا۔"

اے اہلِ ایمان! بہت گمان کرنے سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں، اور ایک دوسرے کے حال کا تجسّس نہ کیا کرو۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ:

"اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ، فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ، وَلَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا، وَلَا تَبَاغَضُوْا، وَلَا تَدَابَرُوْا، وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا۔" (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بدگمانی سے بچو، بدگمانی سب سے بڑی جھوٹی بات ہے، اور کسی کی بات کان لگا کر نہ سنو، کسی کے عیب کی جستجو نہ کرو، دام دے کر قیمت نہ بڑھاؤ، آپس میں حسد نہ کرو، آپس میں بغض و عداوت نہ رکھو، ایک دوسرے سے مقاطعہ نہ کرو، اور ہو جاؤ اللہ کے بندے بھائی بھائی۔

اعتقاد و تصور کے اعتبار سے بھی اسلام ممتاز خصوصیات کا مالک ہے اور پوری زندگی کو مربوط و منظم رکھنے کے لیے بھی اس کا خاص قانون و ضابطہ ہے، ان اخلاقی اصول و اقدار کے اعتبار سے بھی جن پر باہمی روابط و تعلقات کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، اسلام کا ایک مخصوص نہج و طریقہ ہے، جو دنیا کے کسی مذہب اور قانون میں نہیں پایا جاتا۔ یہ وہ ضابطۂ حیات ہے جو پوری انسانیت کی قیادت و رہنمائی کے لیے آیا ہے، کسی خاص ملک اور قوم و نسل کے لیے مخصوص نہیں — لہٰذا ایک ایسے معاشرے کا وجود ضروری ہے جو باہم الفت و محبت اور ربط و تعلق کا عملی نمونہ ہو، تاکہ وہ انسانیت کی رہنمائی و قیادت کا حق ادا کرسکے، اور یہ عملی محبت و اخوت دوسری قوموں کے لیے سنگ میل کا کام دے سکے تاکہ اس کو دیکھ کر عمل کا شوق و جذبہ پیدا ہو — اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اخوت کے مفہوم کی گہرائی و گیرائی کو بیان فرمایا اور اس کے دُور رس اثرات کی وضاحت فرمائی اور ان تمام باتوں کو بیان فرمادیا جو اُخوت کے شیرازے کو منتشر کرتی ہیں اور اس میں دُوری اور خلل پیدا کرتی ہیں۔ ان میں سب سے نقصان دہ اور مُضر بدگمانی دوسروں کے عیوب کی ٹوہ ہے، باہم نامعقول فخر و غرور کا مظاہرہ ہے، مادیت پرستی اور انانیت ہے — انھیں چیزوں میں خریداری کی نیت کے بغیر سودا بیچنے والے کو فائدہ پہنچانے یا خریدار کو نقصان پہنچانے کے خیال سے دام کو بڑھانا بھی شامل ہے۔ یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو محبت و اخوت کی راہ میں رکاوٹ ڈالتی ہیں، بلکہ فتنے کی آگ بھڑکاتی ہیں — اسی لیے حدیث کی ابتدا آگاہی اور ڈرانے کے انداز میں ہوئی ہے۔ خبردار بدگمانی سے بہت دُور رہو — اس آگاہی اور ڈرانے کے بعد ان چیزوں کو بیان فرمایا جو اخوت کی راہ میں حائل ہوتی ہیں، اور ان سے بچنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان دو بنیادی باتوں کا خیال نہ کیا جائے جن پر اسلامی معاشرہ قائم ہوتا ہے — یہ دونوں ضروری باتیں ایمان اور باہم برادرانہ روابط و تعلقات ہیں۔

خدا پر ایمان اور زندگی کے ہر ہر لمحے میں اس کا خوف اور پاس و لحاظ اور

اللہ کے لیے بھائی چارہ ہی وہ چیزیں ہیں جو اُمتِ مسلمہ سے وہ زندہ، قوی اور محکم ومضبوط مادّہ وجود میں لاتی ہیں جو انسانی زندگی میں اپنا مؤثر رول ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو ڈراتے ہیں، ان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ بدگمانی سے بچیں، دل میں پیدا ہونے والے ہر خیال وگمان اور شک وشبہ کو قبول کرلینے کے لیے اپنے نفس کو آزادانہ چھوڑ دیں، کہ دوسروں کے متعلق دل میں جو بھی خیال آئے اس کو حقیقت سمجھ لیں اور اس کے تقاضے پر عمل کر بیٹھیں۔ اسلام اصلاً تو بدگمانی سے بچنے کا مطالبہ کرتا ہے لیکن چونکہ انسان کو یہ نہیں معلوم کہ اس کا کون سا گمان گناہ ہوگا۔ لہٰذا سرے سے گمان ہی سے منع فرمایا ہے۔ اس تعلیم کے ذریعہ ہر فرد مومن کے باطن کو، اس کے دل وضمیر کو پاک کرنا مقصود ہے کہ کہیں وہ بدگمانی میں مبتلا ہوکر گناہ گار نہ ہو جائے۔

حدیث کا منشا یہ ہے کہ بندۂ مومن کا دل بے جا خیالات اور شکوک وشبہات سے صاف شفاف رہے، پاک رہے، اس میں مسلمانوں کے لیے ایسی پاکیزہ محبت ہو جس کو بدگمانی داغ دار نہ کرسکے، وہ بے گناہی ہو جو شک کی پراگندگی سے محفوظ ہو، وہ اطمینان قلب ہو جس کو تذبذب اور اُمید بے جا خلجان میں نہ ڈالے، ایسے معاشرے کی زندگی کتنی خوش گوار وسکون بخش ہوتی ہے جو بدگمانی کی لعنت سے پاک ہو، اس میں باہم اعتماد وحُسن ظن کی کیسی فضا پائی جاتی ہے۔

اسلام نے اسی پر بس نہیں کیا کہ دلوں کو وہم وگمان سے پاک کردے۔ بلکہ مسلم معاشرے میں باہم ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ اور معاملہ کرنے کا ایک اُصول مقرر کردیا، یہ وہ اصول ہے جو اسلامی معاشرے میں زندگی گزارنے والوں کے حقوق کی پاس داری کرتا ہے اسی لیے آپ نے آگے فرمایا " اور کسی کی بات کو چھُپ کر کان لگا کر مت سنو"۔ یہ دیکھ کر عقل انسانی حیران رہ جاتی ہے کہ انسان کے شرف وکرامت اور اس کی آزادی کی حفاظت کا حدیث کے ان الفاظ میں کتنی باریک بینی سے خیال رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قابلِ رشک معاشرے کے لیے ایک اصول

بیان فرماتے ہیں کہ کسی کے عیب کی جستجو نہ کرو یعنی لوگوں کی پوشیدہ باتوں کے معلوم کرنے کی فکر میں نہ رہو، حدیث پاک دل کو اس گھٹیا اور پست کام سے پاک رکھنے کی خاطر کمینگی کے اس رُجحان سے روکتی ہے، اس لیے کہ اسلام تو مکارمِ اخلاق پر اُبھارتا ہے نہ کہ پست خصائل و عادات پر۔ زید بن وہب رضؓ سے مروی ہے، ابن مسعود رضؓ تشریف لائے ان کو بتایا گیا کہ یہ فلاں ہے، اس کی داڑھی سے شراب ٹپک رہی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب میں فرمایا، ہمیں دوسروں کی عیب جوئی سے منع کیا گیا ہے، ہاں اگر کوئی چیز کھل کر سامنے آجائے گی تو اس پر مواخذہ کریں گے۔

حضرت مجاہد دوسروں کی عیب جوئی کے بارے میں وضاحت فرماتے ہیں کہ جو بات کھل کر سامنے آجائے اس پر مواخذہ کرو اور جس پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈال رکھا ہے اس کی فکر میں نہ لگو اس کو چھوڑ دو۔

حدیث شریف نے اسلامی معاشرے کے لیے عملی تطبیق و تنقید پیش کی، صرف دل کی صفائی اور ضمیر کی تربیت پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ وہ لوگوں کی عزّت و حرمت اور حقوق و آزادی کے لیے ایک حفاظتی باؤنڈری کا کام دے رہی ہے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "دام نہ بڑھاؤ"، خرید و فروخت کے اندر "نجش" کے لفظ کی تشریح علماء نے یہ کی ہے کہ سودے کا دام ایسا شخص بڑھاتا جائے جس کو خریدنا نہ ہو بلکہ دام بڑھا کر بیچنے والے کو نفع پہنچانا مقصود ہو، قیمت زیادہ کر کے خریدنے والے کو نقصان پہنچانا چاہتا ہو۔ اس کے بعد پھر باہم حسد سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ حسد ایسی چیز ہے جو انسان کے مزاج و طبیعت میں داخل ہے۔ حسد یہ ہے کہ انسان اپنے ہم جنسوں میں سے کسی کو بڑھا ہوا دیکھے تو اس کو پسند نہ کرے۔ حسد کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ حسد کرنے والا اس کوشش میں لگ جائے کہ محسود یعنی جس کو نعمت و فضیلت حاصل ہے اس سے یہ نعمت چھن جائے اور کوئی ایسا

ہوتا ہے جو اس نعمت کو محسود سے چھین کر اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہے اور بعض حاسدین یہ چاہتے ہیں کہ محسود سے یہ نعمت چھن جائے، چاہے اس کو ملے یا نہ ملے۔ خواہش یہ ہوتی ہے کہ محسود محروم ہو جائے۔

یہ تمام صورتیں اخوت اسلامی سے میل نہیں کھاتیں، لہٰذا دل کو ان سے پاک کرنا اسلامی معاشرے کے ہر فرد کی تربیت کرنا، جماعت کا ان بیماریوں سے پاک صاف رکھنا ضروری ہے۔ جبھی صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حسد سے بچو، حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔" راوی کو شک ہوا کہ آپ نے لکڑی کے بجائے گھاس کا لفظ فرمایا۔

ان مطالب کی وضاحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مناسبتوں سے فرمائی ہے اور شبہات کو دُور فرمایا ہے، چناں چہ ایک موقع پر فرمایا:

"قابلِ رشک دو ہی طرح کے آدمی ہیں، ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ مال دے اور وہ رات دن اللہ کی راہ میں لُٹائے، دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے کلامِ پاک کا علم عطا فرمایا وہ اس پر دن رات عمل کرتا ہے۔"

اُس کو عربی میں غبطہ کہا جاتا ہے جو اُردو میں رشک کہلاتا ہے۔ اس کے لیے حسد کا لفظ استعارہ کے طور پر معنی میں مشابہت کی وجہ سے کہہ دیا گیا۔

حسد کے شر سے بچنے کے لیے ایک شکل یہ ہے کہ جب کسی کے خلاف دل میں حسد پیدا ہو تو اس حسد کو دل سے نکالنے کی فکر کرے، اگر دل کی اس حالت پر قابو نہ پا سکے تو محسود یعنی جس سے حسد ہے کے ساتھ حُسنِ سلوک کرے۔ اس کے لیے

دعا کرے اس کی خوبیوں کو لوگوں میں بیان کرے ، یہ ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے
اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مزید فرماتے ہیں کہ (آپس میں بغض وعداوت نہ رکھو) اس مہلک وبدترین بیماری سے مسلمانوں کو ڈراتے اور آگاہ فرماتے ہیں کہ کہیں یہ خطرناک مرض مسلم معاشرے میں راہ نہ پا جائے جو ان کے اندر افتراق وانتشار پیدا کردے ، اس لیے کہ تمام مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے باہم بھائی بھائی بنا دیا ہے اور بھائی آپس میں محبت کرتے ہیں باہم غصّہ ودشمنی نہیں رکھتے ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہلک مرض سے محفوظ رہنے اور بچنے کا علاج بھی کھول کر بیان فرمادیا ہے ، آپؐ نے فرمایا : (اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم لوگ جنت میں اس وقت تک نہیں داخل ہو سکتے جب تک کہ مؤمن نہ بن جاؤ اور مؤمن اس وقت تک نہیں بن سکتے جب تک کہ باہم پیار اور محبت نہ پیدا کرو ، کیا میں تم کو ایسی چیز نہ بتادوں کہ اگر اس کو کرلو تو باہم محبت پیدا ہوجائے گی ۔ آپس میں ایک دوسرے کو سلام کیا کرو ۔ پھر آپؐ نے فرمایا ، آپس میں ناراضی اور قطع تعلق نہ پیدا کرو ۔ حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ بے رخی اور قطع تعلق کا خاتمہ محبت کو اپنائے بغیر نہیں ہوسکتا اس لیے اگر کسی وقت ناراضی اور قطع تعلق کا کوئی سبب پیدا ہو تو محبت کا سہارا لے کر اس کو ختم کردیا جائے ۔

حدیث کے آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ہوجاؤ اللہ کے بندے بھائی بھائی ، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سے قبل جو چیزیں بتائی گئی ہیں اگر ان کو چھوڑ دیا جائے تو آپس میں بھائیوں کی سی محبت پیدا ہوجائے گی ۔ ایسے ہی جیسے اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں کو باہم جوڑنے اور ملانے کا احسان یاد دلاتے ہوئے فرمایا ہے :

" اُذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۔" (آل عمران ـ ۱۰۳)

اور خدا کی مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے
تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے
بھائی بھائی ہو گئے۔

حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ ایسی جماعت کا وجود ضروری ہے جو ان دو اہم بنیادی چیزوں کی حامل ہو: اللہ پر ایمان اور اللہ ہی کے لیے محبت، تاکہ وہ ایمان و تقویٰ اور پھر محبت و الفت کی طاقت سے دشوار و پر مشقت کام کو انجام دے سکے، اور اس کو سہار سکے۔ یہ دونوں چیزیں وقت کی اہم ضرورتوں میں سے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے مسلم معاشرے کے ساتھ جوڑ دیا ہے اور مسلم معاشرے کا ذمے دار بنایا ہے۔

حدیث کا فقہی پہلو

نجش یعنی دام بڑھانا حرام اور دھوکا ہے۔ امام بخاریؒ نے فرمایا: ناجش یعنی دام بڑھانے والا سود خور، خائن ہے۔ یہ دھوکا ہے، غلط ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نجش سے منع فرمایا ہے۔ (متفق علیہ)

اس حرمت کا سبب یہ ہے کہ اس سے مشتری کو دھوکا دینا اور نقصان پہنچانا لازم آتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ دھوکا دہ آگ میں ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ یہ حدیث پاک اخوت اور بھائی چارے پر زور دیتی ہے اور اس کی اہمیت کو واضح کرتی ہے اور ان تمام ذرائع کو ختم کرتی ہے جو اخوت کے شیرازے کو پارہ پارہ کرتے ہیں، ان میں سب سے اہم چیز بدگمانی، دوسروں کی ٹوہ میں لگنا، مادہ پرستی اور نفع اندوزی کا جذبہ ہے، ایسے معاشرے کو وجود میں لانا ہمارے لیے کتنا بہتر ہے جس میں باہم میل محبت کی فضا ہو اور معاملات خلوصِ دل کے ساتھ کیے

جاتے ہوں ۔ ہم ایسے سماج اور سوسائٹی کے کتنے ضرورت مند ہیں جو بھائی چارے کے وسیع مفہوم کو سمجھتا ہو اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوشاں ہو ۔

۲ - یہ حدیث مسلمانوں کے حقوق کا احترام ملحوظ رکھنے کا سبق دیتی ہے ۔ کوئی سودا کر رہا ہے ، لین دین کی بات کر رہا ہے ، تو جب تک وہ اپنی بات ختم نہ کر دے لینے نہ لینے کا فیصلہ نہ کر لے دوسرے کو اس سودے میں بھاؤ تاؤ کرنے کی اجازت نہیں کہ دو آدمی جائز حدود میں لین دین کی جو بات کر چکے ہیں اس میں دخل دے کر ان کے احساسات کو مجروح کرے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" خبردار نہ اپنے بھائی کے سودے کے وقت اپنا سودا بیچو ، نہ اپنے بھائی کے پیغامِ نکاح پر اپنا پیغام دو ۔ "

۱۰

نفاق معاشرے کا مہلک مرض ہے

عن عبد اللہ بن عمرو، أن النبیؐ قال: أربع من کنّ فیہ کان منافقاً خالصاً ومن کانت فیہ خصلۃ منھن کانت فیہ خصلۃ من النفاق حتی یدعھا اذا ائتمن خان، واذا حدث کذب وإذا عاھد غدر، وإذا خاصم فجر۔ (بخاری)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس میں چار خصلتیں ہوں وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان میں کی ایک خصلت ہوگی تو وہ بھی نفاق ہی کی خصلت ہے جب تک اس کو چھوڑ نہ دے، علامتیں یہ ہیں۔ جب امانت دی جائے تو خیانت کرے، جب بات کہے جھوٹ کہے، وعدہ کرے تو ایفا نہ کرے اور جب لڑے تو گالی دے۔

نفاق نہایت گھٹیا اور پست خصلت ہے، اسی لیے مسلمانوں کو نفاق اور اس جیسی دوسری مذموم باتوں سے دُور رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو لوگ منافق ہوں ان سے دور رہنے اور بچنے کی ضرورت ہے، نفاق پُرانا مرض ہے جو مدینۂ منورہ میں اسلام کے داخل ہوتے کے بعد شروع ہوا۔ اس کے بعد پھر ختم نہیں ہوا اگرچہ وقتاً فوقتاً اس کی شکلیں بدلتی رہیں، اس نفاق نے مسلمانوں کی قوت و طاقت اور وقت کے بڑے حصّے کو کافی دنوں تک مشکل میں ڈالے رکھا، قرآن کریم اور حدیث شریف میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے۔

شریعت میں نفاق کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ ایک تو نفاق کی سب سے بڑی

اور بُری قسم ہے، وہ یہ کہ انسان زبان سے تو خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، رسولوں اور اِس زندگی کے بعد والی زندگی یعنی آخرت پر ایمان لائے۔ اور دل سے ان باتوں کا مخالف ہو، یا ان میں سے بعض باتوں کا مخالف ہو، نفاق کی یہ وہ صورت ہے جو عہدِ نبوی میں پائی جاتی تھی ـــ قرآن کریم میں ان منافقین کی مذمت میں بہت سی آیات نازل ہوئی ہیں، منافقین کا پردہ فاش کیا گیا ہے اور ان کا بُرا انجام بتایا گیا ہے کہ یہ جہنم کے بالکل نچلے حصّے میں ڈالے جائیں گے۔

دُوسرا نفاق یا نفاق کی دوسری قسم عمل میں منافقت ہے۔ یہ نفاق جو اس شکل میں پایا جاتا ہے کہ انسان مظاہرہ تو اچھے اور نیک کام کا کرے اور اندر سے معاملہ اس کے برعکس ہو، اس نفاق کا تعلق ان مذموم عادتوں سے ہے، جو اس حدیثِ پاک میں مذکور ہوئیں اور جن کی ہم اس وقت تشریح کر رہے ہیں۔ اس سلسلے کی دوسری احادیث میں بھی ان کا ذکر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث پاک میں نفاق کی پہچان اور عادتیں بیان فرما دی ہیں اور جس شخص کے اندر یہ باتیں پائی جائیں اس کو آپؐ نے منافق قرار دیا ہے۔ جس میں کوئی ایک عادت پائی جائے گی وہ نفاق کی ایک عادت کا مجرم قرار پائے گا حتیٰ کہ اس کو چھوڑ دے۔

ان عادتوں میں پہلی یہ ہے کہ منافق کو جب کسی چیز کا امین بنایا جاتا ہے تو وہ خیانت کرتا ہے۔

امانت ان شریفانہ اور قابلِ تعریف صفات میں سے ہے جن کو لوگ زمانۂ جاہلیت میں بھی اچھی سمجھتے تھے، بعثت سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں امین کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ عام لوگ امانت کے مفہوم کو محض کوئی چیز بطورِ امانت رکھنے کے معنی میں محدود سمجھتے ہیں، حالاں کہ صاحبِ شریعت کے نزدیک امانت بہت وسیع مفہوم رکھتی ہے ـــ اس کے اندر بہت سے معانی پنہاں ہیں اور سب کا مقصود یہی ہے کہ انسان ہر اس معاملے میں جو اس کے حوالے کیا جائے،

اس کا پورا پورا حق ادا کرے، اس میں ادنیٰ کوتاہی نہ برتے، جیسے کسی مادّی امانت کے کسی بھی جز میں خیانت نہیں کرسکتا، اس میں بھی کوتاہی نہ کرے۔ آدمی کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ اس ذمہ داری کے بارے میں وہ اپنے اللہ کے سامنے اسی تفصیل کے مطابق جواب دہ ہے جو اللہ کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"تم میں سے ہر شخص اپنی جگہ پر حاکم ہے، اس سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا، مرد اپنے اہل کا حاکم ہے اس سے رعیت کے بارے میں پُوچھ گچھ ہوگی، عورت اپنے شوہر کے گھر کی مالکہ ہے اس کے متعلق اس سے باز پرس ہوگی، خادم اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے اس سے اس کے متعلق سوال ہوگا۔"

امانت ایسی ذمہ داری ہے، جس کی مسلمان ایک دوسرے کو وصیت و نصیحت کرتے رہتے ہیں۔ اس کی حفاظت کے لیے اللہ سے مدد طلب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص سفر پر روانہ ہو رہا ہوتا ہے تو اس کا بھائی اس سے کہتا ہے "اللہ کے سپرد کرتا ہوں، تمہارا دین اور تمہاری امانت اور تمہارا انجام"۔ لہٰذا ہر مسلمان پر فرض ہے کہ اس ذمہ داری کو بالکل اسی طرح جس طرح اس کا حکم ہے ادا کرے۔ جس نے اس سے انحراف کیا اس نے امانت میں خیانت کی اور اس میں نفاق کی ایک علامت پائی گئی، تاآں کہ اس کو چھوڑ نہ دے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل ہوا۔

منافق کی دوسری علامت یہ ہے کہ "جب بات کہے جھوٹ کہے"۔ مسند میں مروی ہے، آپؐ نے فرمایا:

"یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات کہو وہ تو تم کو سچّا سمجھ رہا ہے اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم اس سے جھوٹ بول رہے ہو۔"

حسنؒ فرماتے ہیں کہ لوگ کہا کرتے تھے کہ نفاق ظاہر و باطن میں تضاد کا نام

ہے، کہنے اور کرنے میں فرق کا نام ہے، اندر اور باہر میں اختلاف و مغایرت کا نام ہے، غرض یہ کہ نفاق وہ بنیاد ہے جس پر جھوٹ کی دیوار کھڑی ہوتی ہے۔

منافق کی تیسری علامت یہ ہے کہ جب عہد کرتا ہے تو دھوکا دیتا ہے اور عہد کو پورا نہیں کرتا، جو کتاب و سنّت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا۔ (بنی اسرائیل-۳۴)

"اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی۔"

دوسری آیت میں فرمایا:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا۔۔۔ (النحل-۹۱)

"اور جب خدا سے عہد واثق کرو تو اس کو پورا کرو۔ اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو مت توڑو کہ خدا کو اپنا ضامن مقرر کر چکے ہو۔"

ایک اور آیت میں فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ (آل عمران-۷۷)

"جو لوگ خدا کے اقراروں اور اپنی قسموں (کو بیچ ڈالتے ہیں اور ان) کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں ان کا آخرت میں کچھ حصّہ نہیں ان سے خدا نہ تو کلام کرے گا اور نہ قیامت کے روز ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کو دُکھ دینے والا عذاب ہوگا۔"

صحیحین میں ابن عمرؓ سے روایت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قیامت کے دن ہر دھوکا دینے والے کا ایک جھنڈا ہوگا جس سے وہ پہچانا جائے گا۔"

دھوکا ہر زمانے میں حرام رہا ہے خواہ مسلمان مسلمان کے درمیان ہو یا مسلم و غیر مسلم کے درمیان۔ حتٰی کہ جس سے معاہدہ ہوا ہے وہ کافر بھی ہو تو عہد کا پورا کرنا ضروری ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے کسی ایسے شخص کو قتل کردیا جس سے معاہدہ تھا تو وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا، جب کہ جنت کی خوشبو اتنی تیز ہوتی ہے کہ چالیس سال کی مسافت سے آتی ہے۔" (بخاری)

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ہم کو مشرکین کے ساتھ کیے گئے عہد کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے، جب تک وہ عہد پر قائم ہیں، عہد کو توڑتے نہیں، ہمیں ان کے ساتھ عہد شکنی کی اجازت نہیں، جب مشرکین کے ساتھ عہد پورا کرنے کا یہ حکم ہے تو مسلمانوں میں آپسی عہد کو توڑنا تو اور ہی بُرا ہے اور ان سے عہد شکنی کرنا زیادہ بڑا گناہ ہے۔

اس حدیث میں منافق کی چوتھی علامت یہ بتائی گئی کہ جب لڑے تو گالی دے۔ یہاں فجور سے مُراد جان بوجھ کر حق سے تجاوز کرنا ہے کہ حق باطل ہوجائے اور باطل حق ہوجائے، یہ بھی اس جھوٹ میں داخل ہوجاتا ہے جس کی ممانعت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جھوٹ سے بچو، بے شک جھوٹ گالی گلوچ تک لے جاتا ہے اور گالی گلوچ جہنم میں لے جاتا ہے۔" صحیحین میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"اللہ تعالیٰ کو وہ شخص سب سے زیادہ مبغوض ہے جو بہت زیادہ جھگڑالو ہو۔"

آپؐ نے فرمایا:

"تم لوگ اپنے لڑائی جھگڑے ہمارے پاس لاتے ہو، یہ ہوسکتا ہے تم میں کوئی اپنے دلائل پیش کرنے میں زیادہ تیز اور چرب زبان ہو اور میں تو اپنے سننے کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں تو اگر میں کسی کے لیے اس کے بھائی کے حق میں فیصلہ کردوں تو وہ اس کو نہ لے، کہ اس صورت میں

میں اس کے لیے آگ کے ایک ٹکڑے کا فیصلہ کر رہا ہوں۔"

سنن ابوداؤد میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"جو ناحق کو ناحق جانتے ہوئے اس کے لیے لڑا اور اس کو اپنا حق بتایا تو وہ جب تک اس کو چھوڑ نہ دے، اس سے الگ نہ ہو جائے۔ برابر اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سزاوار رہے گا۔"

نفاق کی یہ وہ چار علامتیں ہیں جن پر یہ حدیث مشتمل ہے۔ ایک دوسری روایت میں منافق کی علامتوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ "جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے۔"

وعدہ خلافی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وعدہ کرتے وقت ہی سے وعدہ پورا کرنے کی نیت نہ ہو، یہ بدترین شخص ہے اور اگر اس نے کہا کہ ان شاء اللہ ایسا کروں گا اور نیت نہ کرنے کی ہے تو جھوٹ اور وعدہ خلافی میں شمار ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وعدہ کیا اور نیت وعدہ پورا کرنے کی ہے پھر اس کا خیال بدل گیا اور بلا عذر کے وعدہ خلافی کی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا:

"تم میں سے کوئی شخص ایسا نہ کرے کہ اپنے بچے سے وعدہ کرے اور پھر اس کو پورا نہ کرے۔"

زہریؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کے حوالے سے ذکر فرمایا ہے:

"جس نے بچے سے یہ کہا کہ آؤ تم کو کھجور دیتا ہوں پھر اس کو کچھ دیتا نہیں تو یہ بھی جھوٹ ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تفصیل کے ساتھ نفاق کی پہچان و علامتیں اس لیے بتائی ہیں، تاکہ ہم اس میں مبتلا نہ ہو جائیں اور ان سے دور رہیں جن کے دل بہک گئے اور وہ ان بُری عادتوں کے دل دادہ بن گئے، پوری عمر ان ہی عادتوں میں گزار دیتے ہیں۔

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ قرآن و حدیث میں عہد و پیمان، امانت کی ادائی۔ بیع و شراء اور شرائط کے پورا کرنے کا حکم ہے اور دھوکا دہی، عہد توڑنے اور امانت میں خیانت کرنے کی ممانعت آئی ہے اور جو اس کا مرتکب ہو اس کے بارے میں بڑی وعید ہے۔ جب ایفائے عہد اور اس کے پاس و لحاظ کا حکم دیا گیا تو معلوم ہوا کہ شرائط اور عقد کا صحیح ہونا بھی ضروری ہے۔

۲۔ وعدہ پورا کرنے کے سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے بعض علماء نے تو ایفائے عہد کو واجب قرار دیا ہے ـــ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بیان فرمایا ہے کہ ابن اشوع نے وعدہ پورا کرنے کا فیصلہ دیا ہے۔ اہل ظاہر میں سے ایک جماعت اس کی قائل ہے۔ بعض علماء اس صورت میں ایفائے عہد کو واجب قرار دیتے ہیں، جب کہ اس میں موعود (جس سے وعدہ یا عہد ہوا ہے) کا اس میں فائدہ ہو، امام مالکؒ سے بھی یہی بیان کیا گیا ہے، بہت سے فقہاء واجب نہیں کہتے۔

۳۔ دھوکا دہی ہر زمانے میں ممنوع و حرام رہی ہے خواہ مسلمانوں میں باہم عہد و وعدہ ہو خواہ مسلمان و غیر مسلم میں ہو، حتیٰ کہ جس سے عہد ہوا ہے وہ کافر بھی ہو تو عہد پورا کرنا ہوگا۔

۴۔ ایسے ہی اس وعدے اور عہد کا پورا کرنا واجب ہوگا جو حرام نہ ہو اور کسی خاص شریعت سے اس کا حلال ہونا ثابت نہ ہو، مثلاً وہ عہد اور وعدے جو انھوں نے زمانۂ جاہلیت میں کیے تھے اور ان وعدوں کے پورا کرنے کا حکم دیا گیا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"أَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا۔

اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی۔

آیت سے معلوم ہوا کہ بندے نے جو عہد کیا ہے وہ اللہ کے عہد میں شامل ہے،

اگرچہ عہد کرنے سے پہلے اس کو اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا مثلاً نذر یا خرید و فروخت کا معاملہ کرنا کہ اس کے پورا کرنے کا حکم ہے جیسا کہ آیت کریمہ سے اس کا اشارہ ملتا ہے۔

٦۔ اس حدیث پاک کو علماء کی ایک جماعت نے مشکل احادیث میں شمار کیا ہے، اس لیے کہ اس حدیث پاک میں مذکور باتیں کبھی اس مسلمان میں بھی پائی جاتی ہیں جو مومن خالص ہوتا ہے، اور اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ جو دل و زبان سے اسلام کی تصدیق کرتا ہو اور اس کے بعد ان باتوں میں سے کسی بات کا مرتکب ہو تو اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا اور وہ ان منافقوں میں داخل نہیں ہوگا جو ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

موجودہ حالات اور حدیث

١۔ حدیث پاک میں نفاق اور منافق کی علامتوں کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، لہٰذا ہر بندۂ مومن پر ضروری ہے کہ ان مذموم عادتوں سے بچے۔

٢۔ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے مومن بھائی کے اندر اگر نفاق کی عادتوں میں سے کوئی عادت محسوس کرے تو اس کو اس سے منع کرے اور حق کی طرف رہنمائی کرے۔

٣۔ نفاق نہایت مہلک مرض ہے جو امت کو ہلاکت و پستی میں لے جاتا ہے اور اس کے عروج و ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔

٤۔ نفاق ان تباہ کن امراض میں سے ایک ہے جن سے ہمارا موجودہ معاشرہ دوچار ہے، اس وقت کی یہ شدید ضرورت ہے کہ معاشرے کو جھوٹ، خیانت اور دھوکا جیسی منافقانہ باتوں سے پاک کیا جائے اور ایسی تمام باتوں کو معاشرے سے دور کیا جائے جو اس کو توڑتی اور بگاڑتی ہوں۔ یہ سب یہودیوں کی خصلتیں ہیں۔ کسی مسلمان کے لیے زیبا نہیں کہ وہ ان میں مبتلا ہو اور ان عادات ذمیمہ کی اس کو ہوا بھی لگے۔

۵۔ دھوکا دینا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شیوہ نہیں، صحیحین میں ابوسفیان بن حرب سے مروی ہے کہ جب ہرقل نے ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کے بارے میں یعنی کیا وہ دھوکا دیتے ہیں سوال کیا تو ابوسفیان نے جواب دیا کہ نہیں وہ دھوکا نہیں دیتے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر چلے کہ ہمارے لیے آئیڈیل اور نمونہ حضورؐ ہی کی ذات بابرکات ہے۔

۶۔ آیت کریمہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَاخَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔

جس کو اوپر مع ترجمہ آپ پڑھ چکے، نفاق کے بہت سے معانی دھوکا، خیانت، جھوٹ، وعدہ خلافی، اور ان کے برے انجام پر مشتمل ہے۔

۷۔ نفاق کی ان چاروں عادتوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے سے ملا کر مسلسل ذکر فرمایا ہے جس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ یہ سب چیزیں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، یہ آپؐ کی بلاغت لسانی کی دلیل ہے، خیانت، دھوکا، جھوٹ، گالی، یہ سب ایک جنس سے ہیں، جو شخص ان میں سے کسی ایک کا مرتکب ہوگا، دوسری کے لیے دروازہ کھل جائے گا۔ خیانت کے لیے جھوٹ بولنا لازم ہے، کہ جب امانت مانگی جائے گی انکار کرے گا اور جھوٹ بولے گا۔ اس طرح خیانت سے جھوٹ پیدا ہوگا اور جھوٹ سے دھوکا جنم پائے گا اور دھوکے سے گالی جنم پائے گی، وہ شخص خوش نصیب ہے جو ان ناپسندیدہ صفات سے اپنے آپ کو بچا لے جائے۔

---

(۱۱)

ظاہر و باطن دونوں کا پاس و لحاظ

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ" (مسلم)

بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری صُورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔

عرب قوم کی کچھ قابلِ تحسین صفات وعادات تھیں۔ کچھ خوبیاں، رسوم اور رواج تھے، جو صحرائی زندگی کے اثرات سے پائے جاتے ہیں انھیں صفات میں سے جود و سخا، بہادری وخودداری، فخر وغرور، اپنی ذات وطاقتِ جسمانی پر اعتماد، ظاہر اور شکل وصورت کی طرف زیادہ توجہ دینا اور ان سے ملتی جلتی اور دوسری صفات بھی تھیں اور انہیں کو اُس دور میں معیار و پیمانہ تصوّر کیا جاتا تھا۔

اِسلام آیا تو اس نے ان اقدار اور پیمانوں کو صحیح رُخ دیا اور ان خصوصیات کو ظاہر پرستی اور دکھاوے سے پاک کیا اور خلوت وجلوت اور ظاہر و باطن ہر حال میں شریعت کے پاس و لحاظ، خشیت وخوفِ خداوندی کی طرف پھیرا۔ یہ ساری تبدیلیاں تدریجاً اور موقع ومناسبت کی رعایت کرتے ہوئے کی گئیں۔ زمانۂ جاہلیت میں جب وہ اپنے خداؤں کے نام پر جانور ذبح کرتے تو اس قربانی کا گوشت بُتوں پر رکھ دیتے اور اس ذبیحہ کا خون بھی اسی پر چھڑکتے۔ جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

"لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوٰى

مِنْكُمْ" (حج ۔ ۳۷)

خدا تک نہ اُن کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون ، بلکہ صرف تمہاری پرہیزگاری پہنچتی ہے ۔

اِس ارشاد کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے دلوں کو ہر شائبے سے پاک حقیقت ایمانی کو تقویٰ سے جوڑ دیا اور بے معنی جاہلی عادات کو ایمان کے دائرے سے خارج کر دیا۔ اور مسلمانوں کو فخر و ریاکاری اور ظاہر پرستی جیسی قبائلی عادات کو چھوڑنے کی تعلیم دی ۔

یہ حدیث تمام ایمانی اعمال کے تصور و خیال یعنی نیت درست رکھنے اور کھلے چھپے ، ظاہر و باطن ہر حال سے اللہ کے باخبر رہنے اور تقویٰ یعنی خدا کا دھیان اور پاس و لحاظ رکھنے کا احساس و شعور پیدا کرتی ہے ۔ آپؐ نے فرمایا : لیکن وہ تمہارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ہے تاکہ نفسِ انسانی کو بے جا خواہشوں سے پاک فرمائیں ،۔ اور احسان یعنی خدا کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو یا اگر اتنا نہیں تو یہ خیال رکھو کہ اللہ تعالیٰ تم کو دیکھ رہا ہے ۔ کے مرتبے پر پہنچا دیں ۔ اور جب نفس انسانی اس مرتبے کو پہنچ جائے گا تو اطاعت و عبادت کے سارے کام کرے گا اور گناہ و نافرمانی کی تمام باتوں سے بچے گا اور چھوٹے بڑے کھلے چھپے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا دھیان رکھے گا ۔ اس طرح مسلمان جو کام بھی کرے گا ، زندگی کی گزرگاہوں میں جو قدم بھی اُٹھائے گا اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہی کو پیشِ نظر رکھے گا ، اس کے دل میں تقویٰ کی کیفیت موجزن ہوگی ، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہی اس کے عمل کا مطمح نظر ہوگا ۔ جب مومن کی پوری زندگی عبادت ہے اور اس کی تخلیق کا یہی مقصد ہے تو اس طرح اس مقصد کی تکمیل ہو جائے گی اور اس کے ذریعے دنیا کی زندگی بھی درست ہو جائے گی اور اسی سے آسمان یعنی آخرت کی زندگی بھی سنورے گی

——— ☆ ———

حدیث کا فقہی پہلو

اللہ تعالیٰ کی اصل عبادت وہ ہے جس میں شرک وریاکاری نہ پائی جاتی ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مجھے تمہارے بارے میں جس بات کا سب سے بڑا خطرہ ہے وہ یہ کہ تم شرک اصغر میں نہ مبتلا ہو جاؤ، صحابۂ کرام نے عرض کیا، اللہ کے رسولؐ! "شرک اصغر" کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "ریاکاری" کہ یہ چیونٹی کے رینگنے کی آواز سے بھی پوشیدہ طریقے پر آجاتی ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتِ بے پایاں سے شرک خفی کو بخش دے گا جو ریا کی وہ صورت ہے، جس کا انسان کو احساس نہیں ہوپاتا اور نہ وہ اس کے ارادے سے ہوتی ہے، لیکن اس ریا کو نہیں معاف کرے گا جس کو انسان جان بوجھ کر اپنے قصد وارادے سے کرتا ہے تاکہ اس کی تعریف کی جائے۔ اس عمل سے خداوند قدوس کی رضا نہیں مقصود ہوتی، ہاں اگر اصلاً تو عمل اللہ کی رضا جوئی کی نیت سے شروع کیا لیکن بعد میں ریا کا خیال پیدا ہوا اب اگر اس نے اس ریا کے خیال کو دل سے نکال دیا، تو اس سے نقصان نہیں ہوگا، اس پر تمام علماء متفق ہیں اور اگر دل میں ریا کا خیال پیدا ہوا اور اس خیال کو باقی رہنے دیا تو اس کا عمل اکارت جائے گا یا اس کو اس کی نیت پر ثواب ملے گا ــــ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام احمد اور ابن جریر نے اس کو بیان کیا ہے اور اس خیال کو ترجیح دی ہے کہ اس کا عمل باطل نہ ہوگا اس کو اس کی پہلی نیت پر جزا ملے گی۔ حضرت حسن وغیرہ سے بھی یہی مروی ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

حدیث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ:

۱۔ عمل کو صرف اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے، نفس اللہ کے ماسوا کی عبادت کے تصور وخیال سے الگ اور دور رہے۔

۲۔ مومن کی تربیت اس طرح ہو کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے حکموں کا پاس و لحاظ یعنی تقویٰ پیدا ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور نجات کا یہی سہارا ہے۔

۳۔ غلط عادتوں، رسوم و رواج، ظاہر پرستی اور ریا کاری کی دوسری تمام باتوں کو چھوڑ دیا جائے۔

۴۔ حدیث ظاہر کو مطلق بے معنی نہیں قرار دیتی بلکہ اسی کو اصل پیمانہ بنا لینے سے منع کرتی ہے اس لیے مسلمان کے لیے جس طرح اپنے باطن کو پاک صاف رکھنا ضروری ہے اسی طرح اس کے ظاہر کو بھی پاک، صاف اور خوش نما ہونا ضروری ہے، مسلمان کی زندگی کے ظاہر و باطن دونوں پہلو اسی طرح مکمل ہو سکتے ہیں۔

۱۲

بدعت کی مخالفت

عَنْ أم المؤمنين أم عبد الله عائشة رضى الله عنها قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: مَنْ أحدث فِيْ أمرنا هٰذا۔ ما ليس منه فهو رَدٌّ۔ (متفق علیہ)

جس نے ہمارے اس دین میں ایسی چیز پیدا کی جو اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ناقابل قبول ہے۔

ایمان وہ بنیادی رکن ہے جس کے ذریعے اسلام نے مسلمان کی شخصیت سازی کا کام شروع کیا، اس لیے کہ ایمان ہی وہ اصل ہے، جو مسلمان کے جذبات کو حرکت دیتی ہے اور ارادے کو صحیح رُخ کی طرف موڑتی اور اس کی رہبری کرتی ہے اس لیے کہ جب بندۂ مومن کے اندر ایمان کے اصول درست و صحیح ہو جائیں گے تو دوسری اہم بنیادی چیزیں بھی اس میں پختہ ہو جائیں گی، اور وہ نیکی، حق وصداقت اور بھلائی کی راہ پر ثبات و استقامت کا زیادہ خوگر ہو جائے گا اور زندگی کے نو بہ نو راستوں کو دریافت کرنے اور ان پر اپنے فیصلے کو جاری کرنے پر زیادہ قابو یافتہ ہوگا۔

اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کے عقیدے کو گمراہی اور نقص پیدا کرنے والی چیزوں سے محفوظ رکھنے کا فکر و اہتمام فرمایا ہے حتیٰ کہ آپ نے مذکورہ بالا حدیث میں فرمایا: جس شخص نے بھی دین کے اندر کوئی نئی بات پیدا کی خواہ عقیدے میں ہو یا عبادت میں، وہ مردود و ناقابل قبول ہے اور وہ شخص مستحق سزا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا:

"جس نے کوئی نئی چیز پیدا کی یا نئی چیز پیدا کرنے والے کو پناہ دی
تو اس پر خدا کی لعنت ہو۔"

یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے خالص اور صاف وشفاف عقیدے اور عبادت کو غلط چیزوں سے خلط ملط ہو جانے سے محفوظ رکھیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے جب طریقِ نبوی ؐ سے ہٹ کر، عقل سے کام لینا شروع کر دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایمان کو اس کی سادگی اور ایجابی عمل سے پھیر کر اس کا رُخ فلسفیانہ اور کلامی بحثوں کی طرف کر دیا، جس کی وجہ سے اسلام حلقوں، گروہوں اور مسلکوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہر مکتبِ فکر اپنا الگ حلقہ رکھتا ہے اور ہر ایک خود کو حق کہتا ہے اور دوسرے کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ عقیدے میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ شریعتِ مطہرہ جس طرح نازل ہوئی تھی، اسی طرح اس پر عمل باقی نہ رہا بلکہ اس سے انحراف پیدا ہو گیا۔ اور فرد، خاندان، معاشرہ اور حکومت غرضے کہ زندگی کے ہر شعبے میں ایک عام ضعف پیدا ہو گیا اور اُمّت مسلمہ ترقی سے عاجز ودرماندہ ہو کر رہ گئی اس میں قوموں کی قیادت وپیشوائی اور جماعتوں کی ہدایت ورہنمائی کی وہ صلاحیت نہ باقی رہی جو اللہ تعالیٰ چاہتا تھا، اسی لیے ضروری تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عقیدے کو صحیح رکھنے پر زور دیں اور اس کی تاکید فرمائیں۔

اسی لیے فرمایا:

"جس نے ہمارے اس دین میں نئی چیز پیدا کی جو اس میں نہیں
ہے تو وہ مردود اور ناقابل قبول ہے۔"

لہذا مسلمان پر فرض ہے کہ زندگی کے ہر ہر قدم پر قرآن کریم اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معیار وپیمانہ کو مضبوطی سے تھامے رہے، اس لیے کہ آپ ؐ کی وفات دین کے مکمل ہو جانے اور اس آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد ہی ہوئی ہے:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔" (مائدہ - ۳)

آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کردیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔

اس آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد آپؐ اسّی دن سے زیادہ بہ قید حیات رہے، آپؐ کی زندگی میں دین مکمل ہوچکا تھا کوئی کمی اور خلا نہیں باقی رہا تھا کہ اس میں اضافے کی ضرورت پیش آئے — ہاں جب حالات کے تغیر سے نئے حالات پیدا ہوں گے تو کتاب وسنت کی روشنی میں ان کا حل اجتہاد کے ذریعے کیا جائے گا۔ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے لیکن یہ اجتہاد وہی شخص کرسکے گا، جس میں اجتہاد کے شرائط بھی پائے جاتے ہوں، جیسے حضرت معاذ بن جبلؓ نے اجتہاد فرمایا تھا۔

اس کے علاوہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ دین کے اندر اپنے عقیدہ وعبادت اور معاملاتِ زندگی میں کچھ ردّوبدل اور کمی وبیشی کرے، اس لیے کہ بدعت سے بڑھ کر دین کو بگاڑنے اور اس کو ڈھانے والی کوئی اور چیز نہیں۔ اسی لیے بدعت سے بار بار ڈرایا گیا ہے اور اس سے دنیا میں جو اختلاف وانتشار پیدا ہوتا ہے اور آخرت میں جو ذلت ورسوائی ہوگی اس سے پردہ اُٹھایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَھُمُ الْبَیِّنَاتُ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ۔" (آل عمران - ۱۰۵ - ۱۰۶)

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو، جو متفرق ہوگئے اور احکامِ بیّن کے آنے کے بعد ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے، یہ وہ لوگ ہیں جن کو (قیامت کے دن) بڑا عذاب ہوگا جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے منہ سیاہ۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اہل سُنّت کے چہرے روشن ہوں گے اور اہل بدعت کے چہرے کالے اور بے رونق ۔ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری آیت میں فرمایا :

" وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا " (النساء : ۱۱۵)

اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے رستے کو چھوڑ کر دُوسروں کے رستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے، ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے اور قیامت کے دن جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے ۔

بدعات اکثر دینی فائدے کے نام سے شروع ہوتی ہیں پھر مسلمانوں میں ایسی پھوٹ ڈالتی ہیں کہ دوبارہ ملاپ نہیں ہو پاتا ، اس لیے کہ ان کی ہر بدعت دینی فائدے کا ایسا معیار و طریقہ اپناتی ہے جو دوسری جماعت کے طریقے سے مختلف ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مرور زمانہ کے ساتھ اسلامی ثقافت ہندی، ترکی اور عربی تہذیب کا مجموعہ بن گئی ، اب اگر کوئی ان کو اسلام کی بے داغ ثقافت کی طرف لوٹانا چاہے تو یہ اس کو نہیں پسند کریں گے اور اس کو جمود و بنیاد پرستی کا الزام دیں گے اور مختلف القاب سے نوازیں گے ، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

" فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین، عضوا علیھا بالنواجذ، وایاکم والامور المحدثات فان کل بدعۃ ضلالۃ "
(ابن ماجہ)

فرما کر بدعت پر مہر لگا دی ، حدیث کا ترجمہ یہ ہے :

تو تم پر فرض ہے کہ میری اور ہدایت پانے والے خلفاء راشدین کی سنت کو اپنے دانتوں سے مضبوط پکڑ لو اور نئی نئی باتوں سے بچو بے شک ہر بدعت گمراہی ہے ۔

ایک دن آپؐ منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرما رہے تھے :

"اما بعد! فإن أصدق الحديث كتاب الله وخير الهدی هدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم وشرّ الامور محدثاتها، وكل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة۔" (مسلم، کتاب الجمعہ)

سب سے سچی بات خدا کی کتاب ہے اور سب سے بہتر طریقہ زندگی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے، بدترین بات دین میں نئی چیز پیدا کرنا ہے، ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

مسلم شریف میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے ایسا عمل کیا جو ہمارے دین میں نہیں ہے تو وہ رد اور ناقابل عمل ہے۔"

صحابۂ کرامؓ کتاب وسنّت ہی پر عمل کرنے کے حریص تھے، بدعت اور اہل بدعت سے ان کو سخت نفرت اور عداوت تھی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ کتاب (قرآن مجید) ویسی کی ویسی ہی موجود ہے جیسی نازل ہوئی ہے اور دین ویسا ہی ہے جیسا کہ اللہ کے رسولؐ نے بتایا ہے، حدیث ویسی کی ویسی ہی ہے جیسی آپؐ نے بیان فرمائی ہے اور ہر بات ویسی ہی ہے جیسی آپؐ نے فرمائی ہے اور اللہ تعالیٰ کا وجود کھلی ہوئی حقیقت ہے۔"

حضرت مجاہد فرماتے ہیں:

"ولا تتبعوا السبل"

اور دوسرے رستوں پر نہ چلنا۔

دوسرے راستوں سے مُراد بدعات اور غیر واضح عقائد ہیں، عبد اللہ بن الدیلمی نے فرمایا:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ دین میں خلل سنتِ رسُول اللہ علیہ وسلم کے ترک سے واقع ہوگا۔ دین کا خاتمہ ایک ایک سنّت کے متروک ہونے

سے اس طرح ہوگا جیسے رسی کی مضبوطی اور طاقت اس کے ایک ایک جز کے الگ ہونے سے ختم ہوتی ہے۔"

ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"دین کی پیروی کرو، اس میں نئی باتیں نہ پیدا کرو اگر ایسا کرلیا تو گمراہی سے محفوظ رہوگے۔"

ایک شخص نے حضرت ابن عباس سے نصیحت کی درخواست کی تو فرمایا:

"تقویٰ اور دین پر مضبوطی سے جمنا، دین کے پیرو رہو اور دین میں کوئی نئی بات نہ پیدا کرو۔" —— ان اقوال و آثار کو دارمی نے اپنی سنن میں بیان کیا ہے۔

کتاب و سنت اور اخبار و آثار سب اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ دین کے اندر چھوٹی بڑی ہر قسم کی بدعت خواہ اصول میں خواہ فروع میں، عبادات میں ہو یا عقائد و معاملات میں، زبان سے ہو یا عمل سے، خواہ وہ دین کی کسی بات کو چھوڑنے سے تعلق رکھتی ہو، سب گمراہی ہے، اور جو بھی ایسا کرے گا نافرمان ہوگا، جہنم میں جائے گا۔

یہ حدیث اس بدعت کی مخالفت اور اس سے برسرپیکار ہونے کی بہترین مثال ہے جو لوگوں کو شرک میں مبتلا کرتی ہے جیسے تعویذ لگانا یا باندھنا، غیر شرعی جھاڑ پھونک کرانا، اور شوہر کے دل میں بیوی کی محبت پیدا کرنے یا بیوی کے دل میں شوہر کی محبت پیدا کرنے کے لیے کوئی چیز رکھنا، غیر اللہ کے لیے جانور ذبح کرنا یا نذر ماننا، بزرگوں کی محبت میں غلو کرنا، ان کی قبروں پر مسجدیں بنانا، اور قبروں کے پاس دعا کرنا، کاہنوں اور شعبدہ بازوں پر عقیدہ رکھنا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنی گراں قدر کتاب (اقتضاء الصراط المستقیم لمخالفۃ اصحاب الجحیم) میں ان بدعات کو کھول کر بیان کیا ہے، جن میں وہ کفار کی مشابہت اختیار کرنے کے نتیجے میں مبتلا ہوتے ہیں اور شارع علیہ السلام نے کفّار کے تیوہاروں، ان کے لباس، عبادات اور رسم و رواج سے مخالفت کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کی حکمتیں

بیان کی ہیں اور ان کی مشابہت اختیار کرنے سے جو نفسیاتی اثر پڑتا ہے اس کو بیان کیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کا دینی باتوں سے واقف ہونا، سنّت نبوی کو جاننا اور اس پہ پختگی کے ساتھ عمل پیرا ہوتا، اس طرح کہ اس میں غلو اور حد سے تجاوز نہ ہو، یہ سب اُن ضروری باتوں میں سے ہیں جو اُمّت کے امتیاز اور تشخص کو بحال کرتی ہیں اور اسی کے ذریعے وہ اسلام دشمن تہذیبوں سے چھٹکارا پا سکتا ہے۔

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ کسی مسلمان کے لیے یہ درست نہیں کہ دین کے اندر کوئی ایسی نئی بات پیدا کرے۔ جو قرآن وحدیث میں مذکور نہ ہو اور خاص طور سے عقائد وعبادات کے سلسلے میں تو قطعاً درست نہیں، ایسا کرنا بدعت میں شمار ہوگا جس کی مخالفت ضروری ہے۔

۲۔ بدعت دین کے اندر نئی بات پیدا کرنے کو کہا جاتا ہے۔ جس کا دین کے مکمل ہو جانے کے بعد کوئی جواز نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دین میں اپنی من پسند کی جو چیزیں پیدا کرلی گئی ہیں وہ سب بدعت ہیں۔ بعض لوگوں نے بدعت کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل شدہ حقائق کے برعکس چیزوں کا پیدا کرلینا اور اس کو صحیح دین اور صراطِ مستقیم سمجھنا بدعت ہے۔

بدعت کی دینی اور دُنیوی دو قسمیں ہیں، دین کے اندر پیدا کی جانے والی ہر بات گمراہی ہے۔ دین کے اندر کوئی تبدیلی کرنا اور اس سے پھرنا یا دینی باتوں کی تاویل کرنا گمراہی اور اس کا انجام جہنم ہے ــــ پھر دینی بدعت کی کئی قسمیں ہیں:

(۱) ایسی بدعت جس سے کُفر لازم آئے جیسے انبیاء، صلحاء اور بزرگوں سے دعا کرنا، ان سے مدد چاہنا، مصیبتوں کو دور کرنے کی التجا اور ضرورتوں کو پُورا کرنے کی درخواست کرنا، یہ وہ بدترین بدعت ہے۔ جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف رائج کی گئی۔

(۲) ایسی بدعت جو حرام ہے جیسے مُردوں کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا، ان مُردوں سے دعا کی درخواست کرنا یا اسی طرح قبروں کو سجدہ گاہ بنانا اور اس کے پاس نماز پڑھنا، چراغ جلانا، ان پر شمع روشن کرنے اور جانور ذبح کرنے کی نذر ماننا، اس کا طواف کرنا اور اس سے استلام کرنا، چمٹنا۔ ابن حجر ہیثمی نے ان تمام باتوں کو اپنی کتاب "زواجر" میں گناہ کبیرہ میں شمار کیا ہے۔ یہ سب بدعت و گمراہی ہے لیکن پہلے کے مقابلے میں کچھ کم ہے۔

(۳) بدعت کی یہ قسم مکروہ تحریمی ہے جیسے جمعہ کے بعد ظہر کی نماز پڑھنا یہ تو وہ بات ہے جس کی کتاب وسنت نے اجازت نہیں دی۔ اسی طرح اُجرت لے کر قرآن کریم کو پڑھنا یا پندرہ شعبان کو اجتماعی دُعا کا اہتمام وجشن۔

(۴) بدعت کی یہ قسم مکروہ تنزیہی ہے مثلاً ہر نماز کے بعد امام سے مصافحہ کا اہتمام اور منبروں پر پردے لٹکانا، عاشوراء کی دعا یعنی شروع سال اور سال کے آخر میں کسی خاص اہتمام کے ساتھ دعا کرنا، رہی دنیوی معاملات وفوائد اور معاشی نفع کے سلسلے کی بدعت تو اس میں حرج نہیں بشرطے کہ سودمند ہو، اس سے نقصان نہ پہنچتا ہو، نہ کسی ایسے شر کا موجب ہو جس سے کسی انسان کو نقصان پہنچے، یا اس سے حرام کا ارتکاب ہو رہا ہو، دین کے کسی اصول وشعار کو نقصان پہنچتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اس کی اجازت دی ہے کہ اپنے دنیاوی معاملات اور معاشی ضرورتوں میں جو وسائل بھی ایجاد کر سکتے ہوں، ایجاد کریں بس یہ کہ وہ شریعت کے اُصولوں سے نہ ٹکراتا ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ"

اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو اور نیک کام کرو تاکہ فلاح پاؤ۔

دُوسری آیت میں فرمایا:

"وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ"

اور (دیکھو) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ سَنَّ فِی الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا۔"

جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کیا اس کو اس کا ثواب ملے گا۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ مسلمانوں کو حلال و حرام کے پہچاننے کی فکر ضروری ہے۔ اسی طرح سے معاشرے میں پھیلی ہوئی رسوم اور رواج کی بھی جانچ پڑتال کرتے رہنا چاہیے کہ ان میں کوئی چیز خلافِ شرع تو نہیں رواج پا رہی ہے، جو چیزیں کتاب و سنّت کے مطابق ہوں ان کو تو باقی رکھا جائے، ورنہ چھوڑ دیا جائے تاکہ دین ہر قسم کے غلط شائبے سے پاک و محفوظ رہے، بعض ممالک کے مسلمانوں نے اس بارے میں لاپروائی برتی ہے، جس کے نتیجے میں طرح طرح کی بدعات کا دروازہ کھل گیا ہے۔

۲۔ بدعت کسی نہ کسی سنّت کو توڑ کر ہی قائم ہوتی ہے، جو قوم بھی کوئی نئی چیز، نیا اصول زندگی اور ضابطہ سامنے لاتی ہے اسلام میں اس سے بہتر موجود ہے، مسلمانوں کو اس نئی چیز کو اپنانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، اگر ایسا محسوس ہو کہ کوئی قانون و ضابطہ اسلامی قانون و ضابطہ سے بہتر ہے تو یہ محض شیطانی وسوسہ اور مکر و فریب ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا۔"

بھلا جس کو اس کے اعمالِ بد آراستہ کر کے دکھائے جائیں اور وہ ان کو عمدہ سمجھنے لگے تو (کیا وہ نیکوکار آدمی جیسا ہو سکتا ہے)۔

۳۔ دین میں کوئی نیا اضافہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے دین کے کسی حکم و قانون کو ختم

کردیا جائے ، بدعتی اگر بدعت کی طرف سے صفائی پیش کرے ، اس کا دفاع کرے تو اس کے عقیدۂ توحید کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے ؛ اس لیے کہ وہ گویا دین کو ناقص سمجھتا ہے جب کہ اللہ رب العالمین نے اس کے کامل ہونے کا اعلان فرما دیا ہے اور آپؐ کے بارے میں بھی گویا وہ اس بات کا قائل ہے کہ آپؐ نے کما حقہ دین کی تبلیغ نہیں کی اور پورے دین کو لوگوں تک نہیں پہنچایا — جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت کا حق ادا کردیا ، دین کو پہنچا دیا۔

۱۳

نیکی کے آسان راستے

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال : قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم " کل سلامی من الناس علیہ صدقۃ ، کل یوم تطلع فیہ الشمس قال . تعدل بین الاثنین صدقۃ وتعین الرجل فی دابتہ فتحملہ علیھا أو ترفع لہ علیھا متاعہٗ صدقۃ ، قال : والکلمۃ الطیبۃ صدقۃ ، وکل خطوۃ تمشیھا إلی الصلوٰۃ صدقۃ ، وتمیط الاذیٰ عن الطریق صدقۃ ۔" (مسلم)

" حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "ہر دن جب سورج نکلتا ہے لوگوں کے ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہو جاتا ہے ، فرمایا دو آدمیوں کے درمیان عدل کرو ، یہ بھی صدقہ ہے ، آدمی کی سواری پر سوار ہونے میں مدد دو ، اس کو سوار کرا دو یہ بھی صدقہ ہے یا اس کا سامان اُٹھا کر دے دو یہ بھی صدقہ ہے ۔ آپؐ نے فرمایا اچھی بات کہنا یہ بھی صدقہ ہے ۔ نماز کے لیے جو قدم بھی (مسجد کی طرف) اٹھاتے ہو صدقہ ہے ، راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹاتے ہو یہ بھی صدقہ ہے ۔"

انسان کی ہڈیاں اور جسم کا ڈھانچہ ہی اس کے وجود کی اساس ہیں ، اُنھیں کے ذریعہ وہ منافع حاصل کرتا ہے ، اپنے سارے کام کاج کرتا ہے مختصراً یہ کہ انسان کے حرکت و سکون

کا سارا مدار انھیں ہڈیوں اور جوڑوں پر ہے، انسان پر اللہ تعالیٰ کا یہ عظیم ترین احسان ہے جو شکر و احسان شناسی کا متقاضی ہے اور بندے کو اس خالق کی بڑائی اور عظمت کی طرف متوجہ ہونے کا محرک وداعی ہے جس نے اس کو پیدا کیا اور اس کو نہایت خوب صورت بنایا ایک ایک عضو میں تناسب برقرار رکھا، اس کا حق یہ ہے کہ بندۂ مومن جب چلے پھرے، حرکت کرے، اُٹھے بیٹھے اور اپنے اعضاء آنکھ، کان، ناک سے کام لے جوڑوں کی حرکت اور مڑنے کی صلاحیت سے فائدہ اُٹھائے تو دل کی گہرائیوں سے اس نعمت کی قدر کرے اور ہمہ وقت اس پر شکر گزار رہنے کا خواہاں اور طلب گار رہے، اتنی بڑی نعمت و احسان کا شکر کس طرح ادا ہو، جب کہ انسان کا پورا وجود ہی اس زبردست خالق و بے عیب ذات کی ان عظیم الشان نعمتوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہے، وہ کتنا ہی شکر کرے، اس کی حمد اور پاکی بیان کرے ان نعمتوں کا حق نہیں ادا کر سکتا، لیکن اللہ تعالیٰ رحیم ہے، کریم ہے اپنے بندوں کے ساتھ لطف و عنایت کا معاملہ فرماتا ہے لہذا حمد و شکر کے بہت سے دروازوں کو کھول کر اس کو سہل اور آسان بنا دیا ہے اور بہت تھوڑی سی توجہ اور محنت سے نعمت کا حق اور شکر ادا کیا جا سکتا ہے۔ انھیں آسان راستوں اور سہولتوں ہی میں سے صدقہ کی وہ شکل ہے جس کو اس حدیث پاک میں بیان کیا گیا ہے کہ صدقہ کا انحصار صرف مال خرچ کرنے ہی پر نہیں ہے، دو انصاف چاہنے والوں، لڑنے والوں یا ایک دوسرے سے قطع تعلق کرنے والوں کے درمیان انصاف کرتا ان کو ملا دینا صلح کرا دینا یہ بھی صدقہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا۔" (النساء - ۱۱۴)

ان لوگوں کی بہت مشورتیں اچھی نہیں، ہاں (اس شخص کی مشورت اچھی ہو سکتی ہے) جو خیرات یا نیک بات یا لوگوں میں صلح کرنے کو کہے۔ اور

جو ایسے کام خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرے گا، تو ہم اس کو بڑا ثواب دیں گے۔

اسی طرح سے کوئی شخص سواری پر سوار ہونا چاہ رہا ہے، جانور کے سرکش ہونے کے سبب یا اپنی کمزوری کی وجہ سے سوار نہیں ہو پاتا، اب سوار ہونے میں اس کو سہارا دینا اور سوار کرا دینا یا سوار ہو گیا ہے سامان نیچے ہے، سامان اٹھا کر اس کو دے دینا، یہ بھی صدقہ ہے، اچھی بھلی میٹھی بات کہنا اور بھلے کام کی ترغیب و تلقین کرنا یہ بھی صدقہ ہے، انسان اپنی جائے قیام یا گھر سے نماز کے لیے نکلتا ہے تو جو قدم بھی وہ نماز کی سمت کو اٹھا رہا ہے، وہ صدقہ ہے، راستے میں کوئی تکلیف دہ چیز پڑی ہوئی ہے اس کو ہٹا دیتا ہے کہ بے خبری میں کسی کو چوٹ نہ لگ جائے، پاؤں میں چبھ نہ جائے اس کو راستے سے ہٹا دیتا ہے یہ بھی صدقہ ہے۔

اس کے بعد آنے والی تمام احادیث صدقے کے مختلف طریقوں کو واضح کرتی ہیں۔

۱۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر مسلمان پر صدقہ کرنا واجب ہے، صحابۂ کرام نے عرض کیا، اللہ کے رسولؐ جس کے پاس کچھ ہو ہی نہیں وہ کیا کرے؟ آپؐ نے فرمایا: خود سے کام کرے اپنے کو بھی فائدہ پہنچائے اور صدقہ بھی کرے، صحابۂ کرام نے عرض کیا، اللہ کے رسولؐ جو یہ بھی نہ کر سکے، آپؐ نے فرمایا: پریشان حال ضرورت مند کی مدد کرے، صحابۂ کرام نے عرض کیا اگر وہ اپنے میں مدد کرنے کی صلاحیت نہ پاتا ہو تو؟ آپؐ نے فرمایا: تو نیک کام کرے اور برائی سے بچے، یہ اس کے لیے صدقہ ہے۔"

۲ــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہر شخص پر ہر دن جب سورج نکلتا ہے اپنی طرف سے صدقہ کرنا واجب ہے، میں نے عرض کیا اللہ کے رسولؐ کہاں سے صدقہ کریں ہمارے پاس مال تو ہے نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ اکبر کہنا، سبحان اللہ کہنا،

الحمدللہ اور لاالٰہ الاّاللہ کہنا، استغفراللہ کہنا، تم بھلائی کا حکم دو بُرائی سے روکو، راستے سے کانٹا ہٹا دو، بہرے گونگے سے اس طرح اہتمام سے بات کرو کہ وہ سمجھ جائے، کوئی شخص اپنی ضرورت سے تم سے راستہ معلوم کرے، تمہیں راستہ معلوم ہے اس کو راستہ بتا دو، مصیبت زدہ پریشان حال کی فریاد سُن کر دوڑ پڑو، اپنی قوتِ بازو سے کمزور کو سہارا دو، اس کی مدد کرو، یہ تمام باتیں صدقے میں شامل ہیں۔ تم اپنی بیوی سے ہم بستر ہو تو اس پر بھی تم کو اجر ملے گا۔"

۳ — آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے جو شخص جہنم سے بچنا چاہے وہ صدقہ کرے چاہے کھجور کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، جس کو یہ بھی نہ ملے تو اچھی بات کہے۔"

۴ — آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مسلمان جو بھی پودا لگاتا ہے یا کاشت کرتا ہے تو اس میں سے جو انسان یا جو چوپایا یا جانور کھاتا ہے تو یہ اس کے لیے صدقے میں شمار ہوتا ہے۔"

۵ — آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہر نیکی صدقہ ہے اور نیکی میں یہ بھی شامل ہے کہ تم اپنے مسلمان بھائی سے بشاشت کے ساتھ ملو اور یہ بھی شامل ہے کہ اپنے ڈول کا پانی اس کے ڈول میں ڈال دو۔"

ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ صدقہ کسی خاص قسم کی نیکی پر منحصر نہیں بلکہ ایک عام اصول معلوم ہو گیا کہ ہر اچھا کام صدقہ ہے اور چوں کہ صدقہ بلاؤں کو دُور کرتا ہے اور نماز کے اندر سارے انسانی جوڑ حرکت کرتے ہیں لہٰذا چاشت کے وقت دو رکعت نماز صدقہ کی ان سب صورتوں کے لیے کافی ہو جاتی ہے، جیسا کہ ایک حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے کہ "جس شخص نے صبح کو یہ الفاظ کہہ لیے "اَللّٰهُمَّ مَا أَصْبَحَ بِي مِنْ نِعْمَةٍ أَوْ بِأَحَدٍ مِنْ خَلْقِكَ فَمِنْكَ وَحْدَكَ

لَا شَرِیْكَ لَكَ، فَلَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ۔» تو اُس نے اس دن کا شکر ادا کر دیا اور جس نے رات ہونے کے وقت یہ الفاظ کہے اس نے اس رات کا شکر ادا کر دیا۔ اوپر مذکور الفاظ یعنی دعا کا ترجمہ یہ ہے ــــ اے اللہ مجھ کو یا تیری مخلوق میں جس کو بھی جو نعمت ملی ہے وہ صرف تیری ہی طرف سے ہے، کوئی تیرا شریک نہیں، سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں ہم شکر تیرا ہی ادا کرتے ہیں۔

صدقات کی ان متعدد اور آسان صورتوں کے بعد جن کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر کھول رکھا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث پاک میں بیان فرمایا ہے، کیا ہم پر واجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر یہ جو زبردست نعمتیں اُتاری ہیں اور اپنی رحمتوں کو ان پر وسیع کر دیا ہے ان پر اس کی پاکی و حمد بیان کریں اور کہیں ــــ اے سب پر رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے مولیٰ! تیرے ہی لیے سب تعریفیں ہیں تیرا ہی شکر ہے اے وہ کہ جس کی رحمت ہر شے پر حاوی ہے۔

ان ساری احادیث کی روشنی میں ہم ذرا حدیث شریف کے ان الفاظ (کہ انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ ہے) پر غور کریں اور حدیث پاک سے نبوت کا جو اعجاز ظاہر ہوتا ہے اس کو سامنے لائیں، اس لیے کہ انسان کی بناوٹ مختلف پہلوؤں سے تناسب اعضاء، جوڑوں کا باہمی ربط، جسم کے مسامات، رگوں کا عمل، دل کا عمل ــــ یہ ساری چیزیں غور و فکر کرنے والے کو خواہ سرسری ہی طور پر کیوں نہ ہو، حیرت میں ڈال دیتی ہیں کہ ان کی بناوٹ میں کیسی باریکی اور ندرت پائی جاتی ہے اور پھر اس کے ذہن میں سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ کیا وجہ ہے اور ان ہڈیوں اور جوڑوں کی کیا نزاکت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہر جوڑ جوڑ پر شکر ادا کرنے اور صدقہ کرنے کی نصیحت فرماتے ہیں، جب ہم بناوٹ پر غور کریں اور یہ دیکھیں کہ انسان کی بقا اور بناوٹ میں، اس کی حرکت و عمل میں یہ اعضاء کیا رول ادا کرتے ہیں، تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا حقیقی سبب سامنے آ جائے گا کہ ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہے، آگے ہم چند مثالیں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ بازو ایک ہی ہڈّی سے بنا ہے جب کہ کلائی دو ہڈیوں سے بنی ہوئی ہے، جس سے ہاتھ موڑنے میں آسانی ہوتی ہے۔

۲۔ ران کی ایک ہی ہڈی ہے جب کہ پنڈلی میں دو ہڈیاں ہیں جن سے پاؤں موڑتے اور چلنے میں آسانی ہوتی ہے۔

۳۔ ہتھیلی اور قدم کی ہڈیاں برابر ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قدم کے ٹخنے کی ہڈی جڑی ہے تاکہ جسم کے وزن کو سنبھال سکے اور اس کا توازن برقرار رہے۔

۴۔ چہرہ اور گال کی ہڈیاں ابھری ہوئی ہیں اس طرح کہ آنکھوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں تاکہ ان کی حفاظت و بچاؤ ہو سکے۔

۵۔ بیشتر میں ریڑھ کی ہڈیوں میں ملائم ہڈیوں کا پایا جانا جو مڑنے اور جھکنے میں معاون ہوتی ہیں اور ریڑھ کی ہڈی کو متاثر نہیں کرتیں ان نرم ہڈیوں میں سے کسی میں ذرا سی تکلیف ہو جائے تو مڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔

۶۔ جبڑوں کی حرکت بھی ایک نظام کے تحت ہوتی ہے، اگر جبڑوں کے جوڑوں میں ذرا بھی فرق ہو تو بولنا چالنا، کھانا پینا، منہ کو حرکت دینا مشکل ہو جائے۔

انسان کی ہڈیوں اور جوڑوں کے کام کے سلسلے میں یہ چند بہت معمولی اور عام باتیں ہیں۔ غور کیجیے کہ پورے جسم کا نظام کتنا باریک اور حیرت انگیز ہے اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ (کل سلامی من الناس علیہ صدقۃ) میں کتنا اعجاز پایا جاتا ہے۔ علم طب اور سرجری کی نئی نئی ترقیاں جتنی ہی آگے بڑھتی جائیں گی، اس حدیثِ پاک کا اعجاز اتنا کھلتا اور واضح ہوتا جائے گا۔

اعضاء کا ادھر اُدھر گھومنا اور حرکت کرنا انسان کی بناوٹ خدائی عظمت و کبریائی کا عظیم مظہر ہے، اس کی تشریح میں بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے، جو خود اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے:

"يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ۔" (الانفطار - ۶، ۷، ۸)

اے انسان تجھ کو اپنے پروردگار کرم گستر کے باب میں کس چیز نے دھوکا دیا (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور (تیرے اعضاء کو) ٹھیک کیا اور (تیرے قامت کو) معتدل رکھا (اور) جس صورت میں چاہا، تجھے جوڑ دیا۔

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جو بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں وہ انسان سے ہمہ وقت شکرگزار رہنے کا تقاضا کرتی ہیں اور صدقہ ان نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے جو صرف مال یا نیکی کی کسی خاص شکل کے ساتھ مختص نہیں، بلکہ اس کے لیے مختلف راستے کھلے ہوئے ہیں، عام اصول یہ ہے کہ ہر نیکی صدقہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے آسان اور ہر ایک کے بس کا بنایا ہے۔

۲۔ علماء فرماتے ہیں کہ صدقے کا یہ حکم مستحب اور شوق پیدا کرنے کا ہے، واجب و ضروری نہیں۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ ہڈیوں کا باہم جُڑنا اور محفوظ رہنا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے جس پر شکر کرنا واجب ہے۔

۲۔ دو لڑنے والوں میں صلح کرانے، ان کے مابین انصاف کرنے، ان کی ضروریات میں مدد کرنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ اسلام محبت و بھائی چارے اور اتحاد پر زور دیتا ہے، باہمی نفرت اور غصہ و لڑائی سے روکتا ہے جو لڑائی اور اختلاف کا واضح سبب ہیں۔

۳۔ حدیث سے ذکر و دعا، نماز کے لیے چلنے اور نکلنے کی فضیلت معلوم ہوتی

ہے، اور یہ صدقے کی سب سے بہتر قسم ہے۔

۴۔ نماز کے لیے چلنا اور اس کے لیے قدم اُٹھانا صدقہ ہے تو پھر نماز کی کیا فضیلت ہوگی جب کہ وہ دین کا ستون ہے۔

۱۴

دین پر ثبات واستقامت

عن ابی عمرو، وقیل ابی عمرۃ، سفیان بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ قال: قلت یا رسول اللہ: قل لی فی الاسلام قولاً لا أسئل عنہ أحداً غیرک، قال: "قل: اٰمنت باللہ ثم استقم"۔ (مسلم)

ابو عمرو (بعض نے کہا کہ) ابو عمرۃ، سفیان ابن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ مجھے اسلام کے بارے میں ایسی جامع بات فرما دیجیے کہ اس کے متعلق پھر کسی اور سے نہ پوچھوں، آپ ﷺ نے فرمایا: "کہو اللہ پر ایمان لایا اور پھر اسی پر جم جاؤ۔"

اسلام آیا تو دنیا میں باطل عقائد وخیالات، قصے کہانیوں، بتوں، فلسفوں اور اوہام پرستی کا دور دورہ تھا، جس میں حق وباطل میں صحیح اور غلط میں تمیز باقی نہ رہ گئی تھی، دین وعقیدہ، لغو اور مہمل باتوں میں دب کر رہ گیا تھا۔

لہٰذا اسلام نے سب سے پہلے عقیدے کو درست ومضبوط کرنے پر توجہ دی اور اللہ تعالیٰ کی صفات، مخلوق کے ساتھ اس کا تعلق اور اس کے ساتھ مخلوق کے تعلق کے تصور وخیال کو متعین کیا۔ اس لیے کہ صحیح عقیدہ ہی زمین پر انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کے اعتبار سے زندگی کے میدان میں اس کے مقاصد اور ذمے داری کو متعین کرتا ہے اور اس کو اس زمین کے آباد کرنے اور اس میں خیر کو پھیلانے کا ذمے دار قرار دیتا ہے، اس کی زندگی کا منشاء ومقصود بتاتا ہے، جس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انسان کا وجود عمل میں آیا۔ اسی نزاکت کے

پیشِ نظر ہمیں اس مختصر ترین نبوی نصیحت کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس نصیحت ہی کے ذریعے دو ٹوک انداز میں ہم کو دینِ اسلام کے بنیادی مسائل اور اس کی عملی تحریک و حقیقتِ ثابتہ کا علم ہوتا ہے۔

مومن و مسلم کا دل ہی وہ ظرف ہوتا ہے جس میں خدا پر ایمان کے معانی جاگزیں ہوتے ہیں ایمان کے بعد کی جو چیزیں ہیں وہ اس ایمان کی قدریں اور اسلام کے وہ ارکان ہیں جن کا یہ ایمان مطالبہ کرتا ہے، چناں چہ فرشتوں پر ایمان، اللہ کی کتابوں پر ایمان، اس کے رسولوں پر ایمان، یومِ آخرت پر ایمان، تقدیر کے اچھے بُرے ہونے پر ایمان، اسی طرح سے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ اسلامی حدود اور سزائیں، حلال و حرام، باہمی معاملات، قانونِ شریعت، اسلامی تعلیمات و رہنمائی یہ سب کی سب خدا پر ایمان ہی کی بنیاد و اساس پر قائم ہوتی ہیں۔

قرآن کریم نے عقیدے کو "ایمان" سے اور شریعت کو "عمل صالح" سے تعبیر کیا ہے، جو قرآن کریم کی بہت سی کھلی ہوئی اور واضح آیات میں بیان ہوا ہے، سورۂ عصر میں فرمایا:

"وَالْعَصْرِ، اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ، اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔" (العصر)

عصر کی قسم کہ انسان نقصان میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق (بات) کی تلقین کرتے رہے اور صبر کی وصیت کرتے رہے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

"اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔" (الاحقاف - ۱۳)

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ (اس پر) قائم رہے تو ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

اس لیے کہ ایمان زندگی کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کی تمام سرگرمیوں

رجحانات، تحریکوں اور مشاغل پر محیط ہے۔ ثمّ استقاموا۔ پھر وہ اس پر قائم رہے۔ اس ضابطۂ حیات پر جمنا اور قائم رہنا وہ بلند مرتبہ ہے جو دل میں ایمانی روح سما جانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لفظ "ثم" سے ادا کیا ہے، یہ لفظ ترتیب اور تراخی (یعنی بعد میں آنے) کا فائدہ دیتا ہے اس لیے کہ استقامت کی منزل تو ایمان کے بعد ہی آئے گی۔ اور معمولات و معاملات کے اندر ایمان کے تقاضوں پر استقامت و ثابت قدمی دشوار ترین مرحلے ہیں جس سے مومن کو سابقہ پڑتا ہے، اس لیے کہ زندگی کی پُرخطر راہیں لغزشوں، کانٹوں اور دشواریوں سے بھری ہوئی ہیں، جہاں ہر طرف سے دین سے پھر جانے کی صدائیں آتی رہتی ہیں، جس طرح سے مسلمان کی زندگی ابتلاء و آزمائش اور سخت حالات سے بھری اور گھری ہوئی ہے اسی کے اعتبار سے اس سے صبر و ثبات اور ہر حال میں ایمان کے تقاضوں پر قائم رہنے کا مطالبہ ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے (ثمّ استقاموا) کی تفسیر میں فرمایا۔ انھوں نے ایمان لانے کے بعد کسی اور کو خدا کا شریک نہیں بنایا، حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ ایک دن منبر پر آیت "اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا" پڑھی تو فرمایا، وہ لومڑی کی طرح سے چال نہیں چلے۔ یعنی ایمان لانے کے بعد غیر اللہ سے آس نہیں لگائی، ان کو اپنا حاجت روا نہیں سمجھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (استقاموا) کے معنی فرائض کو ادا کرنا، جن کا یہ حال تھا کہ جب وہ اس آیت کو پڑھتے تو یہ دعا مانگتے: اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبُّنَا فَارْزُقْنَا الْاِسْتِقَامَۃَ۔ یعنی اے اللہ تو ہی ہم سب کا رب ہے تو ہم لوگوں کو استقامت نصیب فرما۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد "فَاسْتَقِیْمُوْا اِلَیْہِ وَاسْتَغْفِرُوْا" سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ استقامت میں کوتاہی ہوگی ضرور اس کا حق کماحقہ، نہیں ادا ہو پائے گا لہٰذا معاً بعد فرمایا۔ اور استغفار کیا کرو کہ استغفار توبہ اور استقامت کی طرف رجوع کا مقتضی ہے جس سے کوتاہی کی

تلافی ہو جائے گی ۔ استقامت کی اصل حقیقت دل کا توحید پر قائم رہنا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضؓ اور دیگر حضرات نے اس کی تفسیر کی ہے، جب دل اللہ کی معرفت، اس کے خوف و تعظیم، ہیبت و محبت، اس سے اُمید و دعا، اسی پر بھروسہ اور توکّل، اس کے ماسوا سے اعراض و بے نیازی پر جم جائے گا تو اس کے اعضا بھی اللہ کی اطاعت میں لگ جائیں گے۔ مسند امام احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپؐ نے فرمایا :

”لَا یَسْتَقِیْمُ اِیْمَانُ عَبْدٍ حَتّٰی یَسْتَقِیْمَ قَلْبُہٗ وَلَا یَسْتَقِیْمُ قَلْبُہٗ حَتّٰی یَسْتَقِیْمَ لِسَانُہٗ ۔“

کسی بندے کا ایمان اس وقت تک نہیں درست ہو سکتا جب تک اس کا دل نہ درست ہو جائے، اور اس کا دل اس وقت تک نہیں درست ہو سکتا جب تک اس کی زبان نہ درست ہو جائے ۔

استقامت پر اس طرح زور دینا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دعوتِ اسلامی کا کام کٹھن اور اس کی راہ پر پیچ و دشوار گزار ہے ۔ اس کے لیے بڑی مشکلات اور کٹھنائیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ اور پھر اس طریقے کی رہنمائی کرتا ہے جو داعیوں کے بلند مقصد کو کامیاب بناتا ہے اور ان کو اس پیغام کا بوجھ اُٹھانے کا اہل بناتا ہے اور ان سے ”اُمّتِ وسط“ کو وجود میں لاتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں یعنی دوسری قوموں کو بطور گواہ و ثبوت اور صراطِ مستقیم کی طرف بلانے اور رہنمائی کرنے کے لیے منتخب فرمایا ہے نیکی کی طرف بلانے اور برائی سے روکنے کے لیے منتخب فرمایا ہے ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

”اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ، وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْ

أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ، نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ۔"

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے، پھر وہ (اس پر) قائم رہے ان پر فرشتے اُتریں گے" (اور کہیں گے) کہ خوف نہ کرو اور نہ غمناک ہو اور بہشت کی، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، خوشی مناؤ۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی (تمہارے رفیق ہیں) اور وہاں جس (نعمت) کو تمہارا جی چاہے گا، تم کو ملے گی اور جو چیز طلب کرو گے تمہارے لیے (موجود ہوگی) یہ بخشنے والے مہربان کی طرف سے مہمانی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قول و عمل اور پوری زندگی میں استقامت کی اعلیٰ مثال تھے، آپؐ اسی کا حکم فرماتے تھے اس پر آمادہ کرتے تھے، اور جب وہ ایمان کے ساتھ جم جائے تو اسی کو آپؐ دعوتِ اسلامی کا حاصل و نچوڑ سمجھتے تھے لہٰذا سوال کرنے والے سے فرمایا: " قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ۔"

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ خدا پر ایمان ہی وہ بنیاد ہے جس پر شریعت کی عمارت کھڑی ہوتی ہے' اور شریعت اور استقامت دونوں ہی نتیجہ ہیں جو عقیدہ کے تابع ہیں، لہٰذا جو خدا پر ایمان تو لے آیا لیکن شریعت کو لغو سمجھا' یا شریعت کو تو اپنایا لیکن عقیدہ کی طرف سے اہمال و لاپروائی برتی تو ایسا شخص ایمان پر قائم اور ثابت قدم نہیں کہلائے گا۔

۲۔ قاضی عیاضؒ نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا کہ یہ حدیث پاک جوامع الکلم یعنی الفاظ کم معانی زیادہ میں ہے جو اللہ تعالیٰ کے قول (اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا) کے مطابق ہے، یعنی خدا کو ایک تسلیم کیا اس پر ایمان لائے پھر اس پر جم گئے، توحید سے ذرا بھی نہیں ہٹے اور تادمِ حیات اللہ تعالیٰ سبحانہ کی اطاعت پر قائم رہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ دین اسلام صرف الفاظ کا نام نہیں جس کو زبان سے ادا کر دیا جائے بس اللہ تعالیٰ پر ایمان کوئی ایسی عبارت نہیں جس کو بولا اور کہا جائے، آگے کچھ نہیں، بلکہ وہ ایک دستور زندگی ہے، اگر وہ صرف لفظ ہوتا تو یہ اسلام کا رکنِ اعظم نہ ہوتا، اس کا شمار اسلام کے ارکان میں نہ ہوتا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو حاکم نہیں تسلیم کیا جا سکتا، غلبہ اور چلن اسی کے قانون کا ہوگا، صحیح راہ وہی ہے۔ جو اس نے بتائی ہے "استقم" کا لفظ ان تمام باتوں پر مشتمل ہے۔ جو ایمان کے بعد ایک بندۂ مومن پر عائد ہو جاتی ہیں۔

۳۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ استقامت کی طاقت تو بڑے اور بزرگ لوگ ہی رکھتے ہیں۔

۱۵

نیکی اور گناہ

عن النواس بن سمعان رضی اللہ عنہ قال: سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن البرّ والاثم فقال: البرّ حسن الخلق، والاثم ما حاك فی نفسك وکرهتَ أن یطلعَ علیه الناس۔ (مسلم)

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کے بارے میں سوال کیا (کہ نیکی کیا ہے، اور گناہ کیا ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیکی اچھے اخلاق کو کہتے ہیں اور گناہ ایسے کام کو کہتے ہیں جو تمہارے دل میں کھٹکے کہ درست ہے کہ نادرست اور تمہیں یہ پسند نہ ہو کہ لوگوں کو اس کا پتا چلے۔

نیکی ایسے خیال و تصوّر، احساس اور ایسے اعمال و برتاؤ کو کہتے ہیں جس کے اثرات فرد اور جماعت کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور پھر وہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس نیکی کا اثر سب سے پہلے اچھے اخلاق کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ حسن خلق ایسا جامع لفظ ہے جو عزیز و اقارب کے ساتھ صلہ رحمی، شرافت نفس اور خاندان کی اچھائی اور قرابت و رشتہ داری کی باہم پیوستگی پر بھی مشتمل ہے اور یتیموں کی دیکھ بھال اور ضائع ہونے سے ان کی حفاظت و نگرانی بھی اس میں شامل ہے۔ یہ حسنِ اخلاق مسلم معاشرے میں غربت و فقر کے مارے ہوئے لوگوں کی فکر و مدد اور ان کو اپنی ہمدردی اور کفالت کا احساس دلانے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس میں کسی بھی شخص کی طرف سے غفلت و

لاپروائی نہیں برتی جاتی، تنگی کے وقت میں کمزوروں اور ضرورت مندوں کی مدد و اعانت میں بھی حُسن اخلاق ہی کا ظہور ہوتا ہے جیسے کہ اچھی طرح سے نماز کا ادا کرنا، عہد کا پورا کرنا، فقر و فاقہ اور پریشانی کے حالات میں صبر، رضا بالقضا حسنِ اخلاق ہی کا مظہر ہوتا ہے تاکہ یہ امت اپنی زبردست ذمہ داری کو سنبھال سکے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انداز سے حسن اخلاق کی دعوت دی ہے۔

ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا:

"اِنَّ مِن أحبکم إِلی واقربکم منی مجلسا یوم القیامۃ أحاسنکم اخلاقاً۔"

تم میں مجھ کو سب سے محبوب اور قیامت کے دن سب سے زیادہ مجھ سے قریب بیٹھنے والا وہ شخص ہوگا جس کے اخلاق تم میں سب سے اچھے ہوں گے۔

خوش دلی اور بشاشت کے ساتھ لوگوں سے ملنا، تواضع اور محبت سے پیش آنا یہ سب نیکی اور حسنِ اخلاق میں شامل ہیں۔ قرآن میں بھی برّ یعنی نیکی کا ذکر متعدد موقعوں پر آیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَیسَ البِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتَابِ وَالنَّبِیِّیْنَ وَ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتَامٰی وَالْمَسَاکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّائِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکَاۃَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عَاھَدُوْا وَالصَّابِرِیْنَ فِی الْبَاْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔

نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب (کو قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منھ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور روز آخرت پر اور فرشتوں پر اور (خدا کی) کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتے داروں اور

یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کے چھڑانے) میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ اور جب عہد کریں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور تکالیف میں اور معرکہ کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

یہ ایک آیت عقیدے کے اصول اور جان ومال کی ذمے داریوں کی جامع ہے اور ان سب کے لیے عنوان ایک ہی اپنایا ہے اور وہ البرّ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ البرّ کا لفظ اسلامی تصور اور اسلامی اصولوں اور اس کے دستورِ کامل کا خلاصہ اور لب لباب ہے۔ رہا إثمٌ یعنی گناہ کا لفظ تو جب ایک مسلمان نیکی کے وسیع معانی کو سمجھ لے گا تو گناہ بھی اس کی سمجھ میں آجائے گا۔ قلب سلیم وطاہر ہر ناپسندیدہ کام کرنے میں متردد ہوگا اور ہر مشتبہ کام سے دور رہے گا۔ اگر خدا نخواستہ کسی نامناسب کام کو کرنے پر مجبور ہوگا تو لوگوں سے چھپے گا، اس کو یہ گوارا نہ ہوگا کہ لوگوں کو اس کے اس عمل کا علم ہوجائے، اس لیے کہ مسلم معاشرہ روئے زمین پر لوگوں کو خدا کا گواہ سمجھتا ہے۔

حدیث کا فقہی پہلو

اس حدیث پاک سے عرف کا تعین ہوتا ہے جو فقہی اصولوں میں سے ایک اصول ہے۔ احناف اور مالکیہ نے اس کو اختیار کیا ہے اور اس کا ثبوت وجواز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ مبارک سے ثابت کیا ہے:

"ما راہ المسلمون حسنا نھو عند اللہ حسن۔"

جس کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھا ہے۔ اور عرف سے ثابت ہونے والی چیز دلیل شرعی سے ثابت ہے۔

اثم (گناہ) کا لفظ چھوٹے بڑے سبھی گناہوں پر مشتمل ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ معیار و پیمانے ہیں جن سے انسان اپنے اعمال کو تولتا ہے۔ جو عمل شریعت کے مطابق ہو اور نفس اس سے مطمئن ہو وہ "بِرّ" ہے اور اگر نفس منشرح نہیں ہوتا، اس کے کرنے میں تردد ہوتا ہے تو وہ کام "اثم" گناہ میں شمار ہوگا۔

۲۔ حدیث سے حسنِ اخلاق کو اپنانے پر اُبھارنے اور آمادہ کرنے کا اہتمام ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا مسلمان کو چاہیے کہ نرم طبیعت ہو، لوگوں سے بشاشت کے ساتھ ملے میٹھے بول بولے کہ خدا اور بندوں، سب کو محبوب ہو۔

۳۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر شاگرد کو کوئی بات معلوم نہ ہو تو استاد سے پوچھے۔

۴۔ جواب مختصر اور قابل فہم ہو۔

———— ٭ ————

۱۶

اِسلام کے پانچ ارکان

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال : سمعت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول " بُنِیَ الاسلام علی خمس : شہادۃ أن لا الٰہ إلا اللہ وأنَّ محمداً رسول اللہ وإقام الصلوٰۃ ، وایتاء الزکاۃ ، وحج البیت ، وصَوم رمضان ۔ (متفق علیہ)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے ، فرمایا : میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ " اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے : کلمۂ طیبہ کی گواہی یعنی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار وایمان ، نماز کا اس کے آداب کے ساتھ ادا کرنا ، مال کی زکوٰۃ دینا ، بیت اللہ شریف یعنی خانۂ کعبہ کا حج کرنا ، رمضان کے روزے رکھنا ۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام کی اساس وبنیاد پانچ ستونوں پر ہے جو شعر کے مصرع کی طرح ہیں کہ مصرع کا ایک حرف ہٹا دیا جائے تو مصرع صحیح نہ رہے گا ، اسی طرح اسلام پانچ ستونوں پر قائم ہے ۔ ان میں سے ایک ستون توحید کا ہے جو مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور وہ ہے کلمۂ شہادت ، باقی چار رکن نماز ، زکوٰۃ ، حج اور روزہ ہیں ۔ کلمۂ شہادت کے دونوں جزوں یعنی اللہ تعالیٰ کی بندگی ، اور عبادت کا طریقہ کیا ہے ؟ یہ ہے دوسرا جزء ، اور یہی دونوں چیزیں عبادات کی اصل ہیں ، بندۂ مومن ومسلم وہی ہے جس کے دل میں یہ ستون اپنے دونوں حصوں کے ساتھ پائے جائیں اس لیے کہ ان دونوں چیزوں کے بعد جو چیزیں ہیں ،

وہ ایمان کی اقدار اور اسلام کا رکن ہیں کہ ان دونوں کا یہی مطالبہ اور تقاضا ہے اور عبادات، معاملات اور شرعی ضابطوں، سب کا مرجع وہ وحیِ خداوندی یعنی قرآن کریم ہے جس کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی طرف سے ہم کو پہنچایا ہے۔

حاصل یہ کہ کلمۂ شہادت ایک مکمل دستورِ حیات کا وہ بنیادی پتھر ہے جس پر امّت مسلمہ کی زندگی اپنے سارے مسائل اور تقاضوں کے ساتھ قائم ہوتی ہے تمام مذاہب و ادیان میں عقیدے کو عمل و عبادت اور احکام وضوابط پر اولیت حاصل رہی ہے اس لیے کہ عقیدے ہی کی اساس پر باقی چیزیں لازم وضروری ہوں گی، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے تمام رسولوں نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی پاکی اور ہر عیب سے اس کے منزہ ہونے کو بتایا، نماز اسلام کی اس عمارت کا مرکزی ستون ہے جس میں مقصدِ زندگی کے بارے میں اسلام کے بنیادی تصور کا لبِ لباب اور خلاصۃ الخلاصہ آجاتا ہے، اسلام انسان کو جسم و روح اور عقل کا مجموعہ بتاتا ہے نماز اس کی ان تینوں طاقتوں کے سرگرم عمل ہونے کا مظہر ہوتی ہے، جو ان تینوں قوائے انسانی کو نظم وضبط کے ساتھ اس کے خالق کی طرف موڑتی ہے۔ قیام اور رکوع وسجود اس کی جسمانی حرکت کا مظہر ہوتے ہیں، قراءۃ، معنی کے اندر غور وفکر میں عقل کو مشغول رکھتی ہے، خدا کے سامنے خود سپردگی و درماندگی کا اظہار، یہ رُوحانی طاقت کا کام ہوتا ہے، نماز چوں کہ ان تینوں قوائے انسانی کا مجموعہ ہے اس لیے وہ دین کا مرکزی ستون قرار پائی، نماز ایمان کی محافظ ونگراں ہے، نماز ہی سے مومن و کافر میں فرق معلوم ہوتا ہے، فرمایا: (أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ) (الروم، ۳۱)

زکوٰۃ متحد اور ایک دوسرے کی فکر وخیال رکھنے والے معاشرے کی ریڑھ کی ہڈّی ہے جو اس معاشرے کے افراد میں محبت واعتماد اور ہمدردی کے جذبات کو عام کرتی ہے اور معاشرے کو تباہ کن سودی نظام اور ناجائز نفع خوری سے بچاتی ہے، زکوٰۃ کو اللہ تعالیٰ نے مال داروں کے مال میں محتاجوں اور فقیروں کا حق بتایا ہے، مال تو درحقیقت اللہ ہی کا ہے، انسان اس کا ٹرسٹی یا نائب بن کر اس کو خرچ کرتا ہے۔ اب اگر انسان

اپنے مال کا تھوڑا سا حصہ خدا کے نام پر خدا کے ضرورت مند بندوں پر بلا کسی فخر و غرور کے اور احسان جتائے بغیر خرچ کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

"وَأَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِينَ فِيهِ۔" (الحدید-۷)

اور جس (مال) میں اُس نے تم کو (اپنا) نائب بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

اور فرمایا:

"وَآتُوهُمْ مِنْ مَالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ۔" (النور-۳۳)

اور خدا نے جو مال تم کو بخشا ہے، اس میں سے ان کو بھی دو۔

تو وہ اپنا نہیں اللہ ہی کا مال دیتا ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انسان کو عزت و کرامت سے نوازا کہ بندۂ مومن اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کر رہا ہے اور اللہ کے بندوں کی اس مال سے جو مدد کر رہا ہے اس کے اس خرچ کو اللہ تعالیٰ نے قرض سے تعبیر فرمایا ہے، فرماتا ہے: (البقرہ-۲۴۵)

"مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً۔"

کوئی ہے کہ خدا کو قرضِ حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اس کو کئی حصے زیادہ دے گا۔

دوسری جگہ فرمایا:

"وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ (المزمل-۲۰)

اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور خدا کو نیک (اور خلوص نیت سے) قرض دیتے رہو۔

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ نفس کی تربیت میں زکوٰۃ بڑا اثر رکھتی ہے کیوں کہ نفس تو بُخل کا شیدائی ہے، اور بُخل بدترین عادت ہے۔ لہٰذا جو زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور اپنے دل سے بُخل کو نکالتا اور دُور کرتا ہے، اس کا یہ عمل اس کو بہت نفع پہنچاتا ہے، اس لیے کہ زکوٰۃ ادا کرنے سے نفس کے اندر جود و سخا کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے

جو نفس کو دنیا کی پست و ذلیل غلطی سے دُور رکھتا ہے۔ قرآن کریم میں بہت سی جگہوں پر زکوٰۃ کو نماز اور ایمان کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے اس کی اہمیت اور تربیتی تاثیر کا پتا چلتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں زکوٰۃ کی جو فضیلتیں اور دنیا و آخرت دونوں جہاں میں اس کے جو فوائد بتائے گئے ہیں، زکوٰۃ دینے سے مال میں جو خیر و برکت ہوتی ہے اور اس پر جس اجر و ثواب کا وعدہ ہے ملے گا، اسی کے ساتھ زکوٰۃ نہ دینے کی جو وعید آئی ہے، زکوٰۃ نہ دینے پر جو دردناک عذاب ہوگا اور دنیا میں زکوٰۃ نہ دینا جس طرح مال کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنتا ہے، ان سب باتوں سے زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے نماز کی ادائی اور زکوٰۃ دینے کو اسلام کے صحیح ہونے کی علامت قرار دیا ہے، ان دونوں چیزوں کو اللہ کے ساتھ صلح اور مسلمانوں کے ساتھ بھائی چارے کا نشان بتایا ہے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ
وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ" (التوبہ — ۱۱)

اگر یہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے لگیں تو دین میں تمہارے بھائی ہیں اور سمجھنے والوں کے لیے ہم اپنی آیتیں کھول کر بیان کرتے ہیں۔

روزہ ارادے کی پختگی، عزم بالجزم اور بندۂ مومن کا اللہ تعالیٰ کے مطیع و منقاد ہونے کے جذباتِ عبدیت کو ظاہر کرتا ہے، روزے میں بندہ اپنے آپ کو اپنی تمام جسمانی ضرورتوں سے بلند کر لیتا ہے، اپنی جسمانی ضروریات پر اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی، آخرت کے اجر و ثواب اور نعمتوں کو ترجیح دیتا ہے، حدیث قدسی میں آتا ہے (کل عملِ ابن آدم لہ إلا الصوم فانہ لی وأنا أجزی بہ) ابنِ آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے سوائے روزے کے کہ وہ ہمارے لیے ہے اس کا بدلہ میں خود ہوں۔

اعضائے انسانی کو معاصی سے بچانے اور خواہشات کا شکار ہو کر انسان کی چھنی ہوئی روحانی صلاحیت کو واپس لانے اور بحال کرنے میں روزہ بڑی تاثیر کا حامل ہے۔

روزہ حصولِ تقویٰ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" (البقرہ - ۱۸۳)

مومنو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تاکہ تم پرہیزگار بنو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان پر روزہ اس کی صلاح و تربیت کے بقدر ہی مشروع فرمایا ہے کہ جس سے وہ دنیا و آخرت دونوں جہاں کا فائدہ اُٹھا سکے، اتنا نہیں کہ جس سے اس کو نقصان پہنچ جائے جو اس کے دینی اور دنیاوی تقاضوں کو پورا کرنے میں حارج ہو جائے۔

حج مسلمانوں کا ایک عالمی اجتماع ہے جس میں وہ اسلام کے رشتے اور تعلق کے علاوہ دیگر سارے تعلقات اور رشتوں سے بے نیاز ہو کر باہم ملتے ہیں، ان کے اس اجتماع کا محرک و سبب صرف اسلام ہوتا ہے، اس لیے حج میں حاجی اپنے ملکی لباس کو اُتار دیتا ہے اور ہر حاجی افراد اور قوموں کے مابین مساوات کے ایک ہی رنگ ڈھنگ میں نظر آتا ہے، حاکم و محکوم، چھوٹا اور بڑا، امیر و غریب، سب کے سب صرف خدا کے بندے اور پجاری نظر آتے ہیں۔ مناسک حج کی ادائی پورے طور پر اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کا مظہر ہوتی ہے۔ تعمیلِ حکم میں حاجی بہت سے ایسے کام کرتا ہے جو بہ ظاہر خلافِ عقل معلوم ہوتے ہیں مثلاً رمی جمار کرنا یا صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا، ایک مقررہ وقت پر مقررہ جگہ میں حاضر ہونا، ان اعمال سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کلّی کا مظاہرہ ہوتا ہے، عقل میں آئے چاہے نہ آئے، وہاں اپنی بندگی کو ظاہر کرتا رہتا ہے، فرمایا:

"تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی" (البقرہ - ۱۹۷)

اور زادِ راہ (راستے کا خرچ) حاصل کرو کیوں کہ بہتر (فائدہ) زادِ راہ (کا) پرہیزگاری ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ حج کے دیگر دنیوی فوائد بھی ہیں، کچھ تو ہماری سمجھ میں آتے

ہیں کچھ نہیں آتے، اس دنیاوی فائدے کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے (لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ۔ الحج۔ ۲۸) تاکہ اپنے فائدے کے کاموں کے لیے حاضر ہوں۔

اسلام کے یہ پانچوں رکن ہی وہ بنیادی ارکان ہیں جن پر اسلام کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، لیکن ایمان وہ مرکزی ستون ہے جو باقی دیگر ارکان کو محکم کرتا اور باہم اچھی طرح جوڑتا ہے۔ اور احسان اسلام کی اس عمارت کو مضبوط بناتا ہے کہ ٹوٹے پھوٹے نہیں، اس کو بلند و مستحکم کرتا ہے کہ سخت سے سخت طوفان اور زلزلوں میں بھی نہ ہلے۔ کبھی انسان ان ارکان کا زبانی اقرار کر کے اپنے اسلام کا اعلان و مظاہرہ کرتا ہے، مگر صرف مظاہرہ اس کو مسلمان نہیں بنا سکتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ۔ (الحجرات۔ ۱۴)

دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے، (بلکہ یوں) کہو کہ ہم اسلام لاتے ہیں اور ایمان تو ہنوز تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمان اسلام قبول کرتے تھے اور پھر عبادت، جہاد اور سیکھنے سکھانے میں لگ جاتے تھے جس سے ان کا اسلام پختہ ہو جاتا تھا کسی کے اسلام میں پختگی کو اس طرح بیان کیا جاتا تھا، کہ فلاں شخص فلاں سن میں اسلام لائے اور ان کا اسلام اچھا ہو گیا۔ اہل سنّت والجماعت کے نزدیک ایمان زبان سے اقرار دل سے اعتقاد اور جوارح سے عمل کو کہا جاتا ہے، اہل سنت کا یہ مسلک ہے کہ ایمان اطاعت سے بڑھتا ہے اور نافرمانی سے گھٹتا ہے، علامہ ابن تیمیہ نے محمد بن نصر مروزی سے نقل فرمایا ہے کہ " ایمان اور اسلام کی مثال ایک خیمے کی سی ہے جب وہ زمین پر نصب کیا جاتا ہے تو اس کے باہر رسّیاں اور میخیں ہوتی ہیں اور اندر ستون ہوتا ہے، پس اس کی مثال اسلام جیسی ہوئی کہ اس کے کچھ ارکان ہوتے ہیں۔ اسلام کا ظاہر

تو اعضاء ہیں جو ان کھونٹیوں کے مانند ہیں جو باہر سے خیمہ کے کناروں کو روکے رکھتی ہیں۔ اور وہ ستون جو خیمہ کے بیچ میں ہوتا ہے اس کی مثال ایمان کی طرح ہے کہ اس بیچ والے ستون کے بغیر خیمہ باقی نہیں رہ سکتا۔

محمد بن نصر اسلام کو ایک بڑے خیمے سے تشبیہ دیتے ہیں جو اس کو باندھتی اور مضبوط کرتی ہیں، وہ ستون جو اس خیمے کے بیچ میں ہوتا ہے وہ ایمان ہے کہ اس کے بغیر خیمہ لگ ہی نہیں سکتا، اگر یہ ستون اپنی جگہ سے ہٹ جائے یا گر جائے تو خیمہ گر جائے گا۔

حدیث کا فقہی پہلو

اس کے مختلف پہلو ہیں۔ ۱۔ حدیث کے ظاہر سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان ارکان میں سے کوئی رُکن چھوڑ دے تو وہ مسلمان نہ رہے گا، لیکن علماء کا اجماع ہے کہ ان ارکان کا اعتقاد و ایمان رکھتے ہوئے اگر ان میں سے کسی چیز کا تارک ہو جائے تو اس کو کافر نہ کہا جائے گا، لیکن اگر ان ارکان کو کوئی ان کے وجوب سے انکار کرتے ہوئے چھوڑے تو وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا اور اس کی سزا وہی ہوگی جو مرتد کی ہوتی ہے کہ توبہ کرے یا پھر قتل کر دیا جائے گا، اگر کسی نے ان ارکان کو تساہلی اور لاپروائی کی وجہ سے چھوڑا تو اس کو ان پر عمل کی دعوت دی جائے گی مثلاً تارک صلوٰۃ سے کہا جائے گا اگر نماز پڑھتے ہو تو ٹھیک ورنہ تم کو قتل کر دیا جائے گا، اس کے بعد اگر اس نے پڑھا تو ٹھیک ورنہ قتل کر دیا جائے گا، لیکن اس کو پہلے تین دن قید میں رکھا جائے گا، اور اس اثنا میں اس کو نماز کی دعوت دی جائے گی اور قتل کی دھمکی دی جائے گی، اس تنبیہ پر اگر پڑھتا ہے تو ٹھیک ورنہ تلوار سے قتل کر دیا جائے گا امام مالک، حماد ابن زید، وکیع اور امام شافعی بھی یہی کہتے ہیں۔ امام زہری کہتے ہیں کہ "اس کو مارا جائے گا اور قید کر دیا جائے گا"، امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔ قتل نہ کیا جائے گا اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (لا یحل دم امرئ مسلم

إلا بإحدى ثلاث: كفر بعد إيمان، أو زنا بعد إحصان، أو قتل نفس بغير حق) کسی مسلمان کا قتل تین باتوں کے بغیر جائز نہیں ہوسکتا، ایمان لانے کے بعد پھر کافر ہوجائے، یا شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کا مرتکب ہو یا بلا جواز کے کسی کو قتل کردے، اور اس شخص سے ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں صادر ہوئی، لہذا اس کا قتل جائز نہیں ہوگا۔

تیمی کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، جس کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام انھیں پانچ چیزوں پر قائم ہے اور پانچوں چیزیں اسلام پر منحصر ہیں، اس لیے کہ کوئی شخص جب تک کلمۂ شہادت نہ پڑھے گا وہ ان چار باتوں کا مخاطب نہ ہوگا اور جب کلمۂ شہادت پڑھے گا تو ہم اسی وقت اس کو مسلمان تسلیم کرلیں گے، پھر اس کے بعد جب وہ ان چار باتوں میں سے کسی بات کا انکار کرے گا تو ہم اس کے اسلام کے باطل ہو جانے کا حکم لگادیں گے۔

کرمانی کا قول ہے کہ اس حدیث کا مقصود اسلام کی تکمیل و اتمام ہے، اسی لیے ان باتوں کا ذکر ایمان کے ساتھ کیا گیا۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ دین کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک ایک ایسی جماعت نہ وجود میں آجائے جو یہ اقرار کرتی ہو کہ اس کی بندگی و خود سپردگی مکمل طور پر صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور وہ عبادات میں، شعائر دین میں، نظام زندگی اور قانون وضابطہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کی تابع داری اور بندگی کے دین وعقیدے کو نہیں تسلیم کرتی۔

۲۔ مسلم معاشرہ اسی وقت وجود میں آسکتا ہے جب اسلام کے یہ پانچوں ارکان مکمل طور پر عمل میں لائے جائیں۔ یہ سب کے سب ضروری ہیں اسلام کے مکمل

ہونے کے لیے ہر ایک دوسرے کو تقویت بخشتا ہے۔ ان میں جو پہلو بھی تشنہ رہے گا۔ اسلام کو مکمل طور پر وجود میں آنے کے لیے رکاوٹ بنے گا۔

۳۔ شعائر عبادات دین اسلام کی تکمیل کے لیے رکن کا درجہ رکھتے ہیں ان کے بغیر دین مکمل نہیں ہو سکتا، مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ صرف ان ارکان پر اکتفا نہ کرے بلکہ عمارت کو اپنے دل میں مکمل و مضبوط کرے اس طرح کہ وہ اخلاق فاضلہ اس کے اندر پائے جاتے ہوں جن کی اسلام تعلیم دیتا ہے۔

۴۔ اِسلام کی بنیاد ان پانچ چیزوں پر ہے یہی عمارتِ اسلام کی بنیاد ہیں، لیکن عمارت کے لیے بنیاد کے علاوہ بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، مسلمان کا ان سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں۔ مثلاً جہاد اور دعوت اسلامی کا کام، اخلاق کے سارے پہلو اور ایمان کے دوسرے تمام شعبے ضروری ہیں تا کہ اسلام مکمل ہو۔

۱۷

غُصّہ اور اس کے نقصانات

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ أن رَجُلاً قال للنّبی صلی اللہ علیہ وسلم أوصنی، قال: "لاتغضب" فردّد مراراً، قال: "لا تغضب"۔ (رواہ البخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اللہ کے رسولؐ! آپ ہم کو نصیحت فرمائیے، آپؐ نے فرمایا: "غصہ نہ کیا کرو" اس شخص نے کئی بار اپنا سوال دہرایا ہربار آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا کہ غصّہ نہ کیا کرو

غصّہ ایک انسانی تاثر ہے جو انسان کے خمیر وفطرت میں داخل ہے، کسی میں کم کسی میں زیادہ، کسی کا تاثر تیز ہوتا ہے، معمولی معمولی بات پر غصّہ ہوجاتا ہے اور اس کے اعصاب میں ایسی ارتعاشی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے کہ اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے عقل وحواس مغلوب ہوجاتے ہیں اور وہ ایسا اول فول بکنے لگتا ہے جو اس کے منصب وپیغام کے شایان شان نہیں ہوتا، غصّے میں وہ ایسی باتیں کہہ دیتا ہے جس سے خود اس کو نقصان پہنچ جاتا ہے یا لوگوں کی نظروں سے گرجاتا ہے یا اس کو اپنے کیے پہ نادم وشرمندہ ہونا پڑتا ہے۔

بندۂ مومن اشرف المخلوقات اور حاصل کائنات ہے، روئے زمین پر بسنے والی تمام مخلوقات سے افضل وبرتر ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری مخلوقات کے مقابلے

میں اس کو بہت سی ایسی خصوصیات وصفات سے نوازا ہے جو دوسری مخلوقات میں نہیں پائی جاتیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نہایت اُونچے مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور اسی اُونچے مقصد کے لیے اس کو تیار فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا"

(بنی اسرائیل ۷۰)

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی اور پاکیزہ روزی عطا کی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔

انسان کے اس شرف وفضیلت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس روئے زمین پر کائنات کو خیر و بھلائی اور اچھے اعمال سے آباد کرنے کے لیے اپنا خلیفہ بنایا ہے اور اس کو اس کے لیے تیار کیا ہے، لہٰذا غصّہ اس کے لیے مناسب نہیں اور نہ انتقام لینا اس کے شایانِ شان اور نہ ہی آپے سے باہر ہو جانا اور غصّہ سے بھڑک اُٹھنا اس کے مقام و پیغام سے میل کھاتا ہے۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کرنے والا شخص معمولی معمولی باتوں پر غصّہ ہو جانے اور بھڑک اُٹھنے کا مریض تھا لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو غصّہ نہ کرنے کی نصیحت فرمائی۔ غصّہ تو ایک فطری چیز ہے۔ غصّے سے آپؐ کے روکنے کا مطلب یہ ہے کہ غصّے کے تقاضے پر عمل نہ کرو، دل میں غصّے سے بے قابو ہو جانے کی جو حالت پیدا ہوگئی ہے اس پر قابو رکھو مغلوب ہو کر ناشائستہ باتیں نہ کرنے لگو، انتقامی کارروائی نہ کر بیٹھو کہ یہ تمہارے مقام سے فروتر بات ہے۔

دینِ اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسانی کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہے اور اس کا ازالہ حکمت کے ساتھ کرتا ہے، اس سے روکتا نہیں بلکہ اس کا امالہ کرتا ہے، غصّہ ایک فطری چیز ہے جو کم و بیش ہر انسان میں پائی جاتی ہے، قرآن کریم اسی طرف

اشارہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ." (شوریٰ - ۳۷)

اور جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی سے پرہیز کرتے ہیں اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں بڑا حکیمانہ اشارہ ہے کہ مومن کی شان یہ ہے کہ جب اس کو غصہ آتا ہے تو اس کے تقاضے پر عمل کرنے کے بجائے معافی اور نظر انداز کرنے سے کام لیتا ہے۔

غصہ ہر موقع پر بُرا نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ کچھ مواقع ایسے ہیں۔ جہاں غُصے کا اظہار اور تنبیہ مطلوب ہے اللہ کی خاطر، اس کے دین کی خاطر، عدل وانصاف اور نفاذ شریعت کی خاطر غصے پر عمل کرنا ہی مطلوب ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لیے کبھی نہ غصہ ہوتے تھے نہ انتقام لیتے تھے، لیکن اگر دین کا کوئی حکم توڑا جاتا تو آپؐ کے غصے کو کوئی روک نہیں سکتا تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے، گھر میں ایک پردہ تھا جس میں تصویریں بنی ہوئی تھیں، اس کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ بدل گیا، پردہ لیا اور پھاڑ ڈالا، فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قیامت کے دن سب سے سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو یہ تصویریں بناتے ہیں۔" (بخاری)

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور شکایت کی کہ فلاں صاحب چوں کہ فجر کی نماز میں لمبی قرأت کرتے ہیں اس لیے میں فجر کی نماز میں تاخیر کرتا ہوں، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم

اتنے ناراض ہوئے کہ ہم نے اس سے پہلے نصیحت و وعظ کے وقت آپؐ کو اتنے غصّے میں نہیں دیکھا۔ آپؐ نے فرمایا:

"یَا أَیُّھَا النَّاسُ إِنَّ مِنْکُمْ مُنَفِّرِینَ فَأَیُّکُمْ أَمَّ النَّاسَ فَلْیُوجِزْ فَإِنَّ مِنْ وَرَائِہِ الْکَبِیرَ وَالضَّعِیفَ وَذَا الْحَاجَۃِ" (ابوداؤد)

اے لوگو! تم میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو (لوگوں کو) دین سے دور کرتے ہیں، تم میں جو شخص بھی امامت کرے نماز مختصر کرے، اس لیے کہ اس کے پیچھے بوڑھے، کمزور اور ضرورت مند سبھی قسم کے لوگ نماز میں شریک ہیں ان کی رعایت کرنی چاہیے۔

حضرت ابومسعودؓ ہی سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت صہیبؓ، حضرت خبابؓ اور حضرت بلالؓ وغیرہ نے فتح مکہ کے موقع پر، جب حضرت ابوسفیانؓ ان حضرات کے سامنے سے گزرے تو حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ باقی حضرات نے حضرت ابوسفیانؓ کو سنا کر طنزاً فرمایا، اللہ کے دشمنوں سے ابھی تلواروں کی پیاس نہیں بجھی، تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا، کیا تم لوگ قریش کے سردار سے یہ بات کہتے ہو؟ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور جو کچھ پیش آیا تھا اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا:

"ابوبکرؓ شاید تم نے ان لوگوں کو ناراض کر دیا، أو کما قال"۔ راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ ان حضرات کے پاس گئے اور ان سے کہا، بھائیو! کیا تم کو ہماری بات سے دُکھ پہنچا ہے، ناراض ہوئے ہو؟ ان حضرات نے فرمایا: ابوبکر! خدا تمہیں معاف کرے۔ ان حضرات نے ابوسفیان سے جو کچھ کہا تھا وہ اللہ ہی کے لیے غصّہ کے سبب سے کہا تھا اس میں اپنی نفسانیت کا دخل نہیں تھا۔

دُوسرے پہلو سے طبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو نئی تحقیقات و تجربوں سے یہ ثابت ہوا ہے کہ دورانِ خون تیز (بلڈ پریشر ہائی) ہونے اور رگوں کے سخت ہوجانے میں

غصّے کو بڑا دخل ہوتا ہے، ایک معاصر امریکی ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ "شدید ہیجانی کیفیت (غصّہ) اُمید کی ناکامی، افکار و ذہنی الجھنیں، یہ سب بلڈ پریشر کے ظاہری اور وقتی نتائج ہوتے ہیں، اس صورتِ حال میں جسم کے اندر طبعی طور پر سزا و انتقام کو عملی شکل دینے کے احساسات تیز ہو جاتے ہیں، یہ کیفیت اسی وقت ختم ہوتی ہے جب وہ سبب و محرک ختم ہو جائے جس نے یہ کیفیت پیدا کی ہے اس نازک حالت کا سمجھنا اور اس پر کنٹرول کرنا ضروری ہے اس کا امکان و خطرہ ہوتا ہے کہ یہ ہیجانی کیفیت کسی افسوس ناک اقدام تک پہنچا دے لہٰذا جو شخص اس میں مبتلا ہو اس کو بہرصورت اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ پرسکون رہے اور اپنے اعصابی تناؤ پر قابو رکھے۔ کیوں کہ اس تاثر میں جو بھی اقدام کرے گا، خطرہ ہے کہ اس سے کوئی غیر متوقع صورت حال پیش آجائے"۔ اس ڈاکٹر نے صرف اس مشورے پر اکتفاء کیا ہے کہ غصّے میں مبتلا شخص پرسکون رہنے کی کوشش کرے، لیکن وہ اس کی تدبیر نہ بتا سکا جب کہ معاملہ بہت نازک ہے کوئی بھی افسوس ناک صورتِ حال پیش آسکتی ہے۔

لیکن انسانیت کے طبیب (محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی متعدد تدبیریں بتائی ہیں، آپؐ نے فرمایا:

۱۔ تم میں سے جب کسی کو غصّہ آئے تو اگر وہ کھڑا ہے تو بیٹھ جائے، اگر اس سے غصّہ ختم ہو جاتا ہے تو ٹھیک ورنہ لیٹ جائے۔

۲۔ فرمایا: پہلوان وہ نہیں جو دوسروں کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصّے کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔

آپؐ نے غصّے میں مبتلا شخص کے بارے میں فرمایا کہ "میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر وہ اس کو کہہ دے تو اس کا غصّہ جاتا رہے ۔۔ اگر وہ غصّے کے وقت اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم کہہ دے تو غصّہ جاتا رہے گا۔ قرآن کریم نے بھی اس مہلک مرض کا علاج بڑے لطیف پیرایے میں بتایا ہے، فرمایا:

"وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ

وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۔ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔
(آل عمران ۔۱۳۳-۱۳۴)

اور اپنے پروردگار کی بخشش اور بہشت کی طرف لپکو جس کا عرض آسمان اور زمین کے برابر ہے اور جو (خدا سے) ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ جو آسودگی اور تنگی میں (اپنا مال خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصّے کو روکتے اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں اور خُدا نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے غصّہ روکنے کو متقیوں یعنی خدا کا پاس و لحاظ رکھنے والے بندوں کی صفات میں شمار فرمایا ہے۔ غصّے کا روکنا پہلا مرحلہ ہے۔ تنہا اتنی بات کافی نہیں جیسا امریکن ڈاکٹر کا خیال ہے۔ کبھی انسان وقتی طور پر اس لیے غصّے کو دبالیتا ہے کہ دل میں کینہ دبائے رکھے اور موقع پاکر اس کا بدلہ لے، قرآن کریم نے غصّہ دبانے پر بس نہیں کیا بلکہ مزید اس کا علاج عفو و درگزر بتایا۔ چناں چہ معاف کرنے والوں کو محسنین یعنی ان خاص بندوں میں شمار فرمایا، جن سے محبت فرماتا ہے، یہ غصّے کے مریضوں کا فطری اور ربّانی یعنی خدائی علاج ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا احسان اور محسنین سے محبت کرنا، انسان کا انسان سے محبت کرنے کا سبب بنتا ہے اور وہ جماعت یا گروہ انسانی جس سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے اور وہ جماعت اللہ تعالیٰ سے محبت کرتی ہے اور وہ جماعت جس میں عفو و درگزر کا چلن ہوتا ہے باہم میل محبت اور بھائی چارے کی صفات رکھتی ہے وہی شوق و مسرت کے ساتھ روئے زمین پر خلیفۃ اللہ ہونے کے معانی کو عملی جامہ پہناتی ہے۔

حدیث کا فقہی پہلو

"زاد المستنقع"، میں ہے غصّے میں دی جانے والی طلاق پڑتی ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔

شیخ صالح فوزان کی رائے ہے کہ جس شخص نے غصّے کی ایسی حالت میں کہ اس کا شعور و قوت تمیز ختم نہیں ہوگئی ہے، طلاق دی تو اس کی طلاق واقع ہوجائے گی اور جس شخص کا غصّہ اتنا تیز ہو کہ جو کچھ بک رہا ہے اس کا اسے احساس و شعور نہیں ہے اس کو کچھ تمیز نہیں کہ کیا کر رہا ہے اس کی طلاق نہیں پڑے گی اس لیے کہ اس کی قوتِ ارادی ختم ہوچکی ہے۔ احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، اور حاکم نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اغلاق کی حالت میں طلاق یا غلام آزاد کرنا صحیح نہ ہوگا۔"

اغلاق کی تفسیر غصّے سے کی گئی ہے۔

غصّے کی تین قسمیں ہیں:۔

۱۔ کسی شخص کا غصّے سے اتنا مغلوب اور مفقودالحواس ہوجانا کہ اس کو یہ ہوش نہ رہے کہ کیا کہہ رہا ہے ایسے شخص کی طلاق نہ واقع ہوگی اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

۲۔ غصّے کا ابتدائی مرحلہ جس میں حواس بجا ہوں اس سے طلاق واقع ہوجائے گی۔

۳۔ غصّہ بھرپور اور تیز ہو لیکن عقل پورے طور پر مغلوب نہ ہوچکی ہو اس حالت کی طلاق قابلِ غور ہے۔

قاضی کے لیے غصّے کی حالت میں کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنا جائز نہیں، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرۃ سے مروی ہے کہ میرے والد نے عبیداللہ بن اُبی بکرۃ کو جو سجستان کے قاضی تھے، خط لکھوایا (جو میں نے ہی لکھا تھا) کہ غصّے کی حالت میں فریقین کے درمیان فیصلہ نہ کرو، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا ہے کہ "کوئی شخص غصّے کی حالت میں دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرے۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نصیحت کہ غصّہ مت ہو معجزاتِ نبوت میں سے

ایک معجزہ ہے جو جدید طبی تحقیقات سے ہی واضح ہو جاتا ہے، گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نفس و دل کے مریضوں کا علاج کرتے ہیں اور ہر مریض کو اس کے مناسب حال دوا دیتے ہیں کسی کو کثرت سے نماز پڑھنے کی نصیحت فرما رہے ہیں دُوسرے کو والدین کی اطاعت کرنے، ان کا ہر طرح خیال رکھنے کی نصیحت فرما رہے ہیں، تیسرے کو غصّہ کرنے سے منع فرما رہے ہیں۔

۲۔ معلم و مربی کے لیے ضروری ہے کہ مخاطب کے مزاج وطبیعت کو سمجھنے کی کوشش کرے پھر ہر ایک کی تربیت اس کے مزاج وطبیعت کی رعایت کرتے ہوئے کرے، اس میں انفرادی فرق اور شخصی صلاحیتوں کا لحاظ رکھے۔

۳۔ غصّہ سے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے، رگیں پھول آتی ہیں۔ اگر غصّے کا مریض غصّے کی حالت میں اپنی ہیجانی کیفیت پر قابو نہیں پاتا تو رگوں کے پھڑک اُٹھنے کا خطرہ ہوتا ہے، وہ بالکل بے قابو ہو جاتا ہے اور ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی دُوسرا شخص اس کو سنبھالے۔ ورنہ غصّہ پانچ بنیادی چیزوں میں سے تین، جان، مال اور عقل کے ضائع ہو جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غصّہ کرنے سے بار بار منع فرمایا۔

۱۸

جہاد اور جنگ کے محرّکات

عن ابن عمرؓ أنّ رسُول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال
اُمرت أن أُقاتل النّاس حتّٰی یشہدوا أن لا الٰہ الا اللّٰہ وأنّ
محمّداً رّسُول اللّٰہ ویقیموا الصّلاۃ ویؤتوا الزکاۃ فاذا فعلوا ذالک
عصموا منی دماءھم وأموالھم الاّ بحقھا وحسابھم
علی اللّٰہ ۔ (بخاری ومسلم)

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حکم ہے کہ میں لوگوں سے جنگ جاری رکھوں اس وقت تک کہ وہ اس بات کی شہادت اداکریں یعنی اس کا اقرار و اعلان کریں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد اللہ کے پیغمبر ہیں، اور نماز قائم کرنے لگیں، اور زکوٰۃ اداکرنے لگیں، پس جب وہ یہ سب کچھ کرنے لگیں تو انھوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے محفوظ کرلیا سوائے حق اسلام کے، اور ان کا حساب اللہ کے سپرد ہے۔

اسلام کسی خاص قوم و قبیلہ یا خاص ملک و خطّۂ زمین کا دین نہیں ہے بلکہ اس کو خالق جہاں نے تمام انسانوں کے لیے اتارا ہے خواہ وہ کسی بھی قوم و نسل سے یا دنیا کے کسی بھی خطۂ زمین سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہر وہ شخص جس کو اس دین کی نعمت نصیب ہو اس کو دوسرے انسانوں تک اس دین کو پہنچانا چاہیے اور اس کی دعوت دینی چاہیے مسلمان حاکم

اور حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ ان تمام انسانی بستیوں میں اس دین کو پہنچائے جہاں کے لوگ اس دین سے بے خبر ہوں اور اس پر عمل نہ کرتے ہوں، دعوت کے اس کام میں اگر کوئی قوم و قبیلہ رکاوٹ ڈالے تو حکومت کو اس سے جنگ کرنا چاہیے تاآں کہ وہ رکاوٹ ختم نہ ہو جائے یا رکاوٹ ڈالنے والے اپنی اس حرکت سے باز نہ آجائیں اور دعوتِ اسلام کے لیے راستہ صاف نہ ہو جائے تاکہ لوگوں کے سامنے دعوت دین پیش کی جاسکے اور لوگوں کو اس کے سمجھنے کا موقع ملے پھر وہ اپنی رضا و رغبت سے اسے قبول کریں یا نہ کریں، اصل لوگوں کو دین سے واقف کرانا ہے، جنگ مقصود نہیں جنگ تو ضرورتاً اس وقت کی جائے گی جب کوئی اس کام میں رکاوٹ ڈالے۔ جہاد کی فضیلت ضرورت کے تحت ہے تاکہ خدا کے بندے خدا ہی کے بھیجے ہوئے دین کو اپنائیں اور ظالم و جابر لوگ اس میں رکاوٹ نہ بننے پائیں، اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں سے جہاد کا حکم دیا گیا جو دعوت کی راہ میں رکاوٹ بن رہے تھے، رہے اہل کتاب تو ان کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ یا تو مسلمان حکومت کو جزیہ دینے پر رضامند ہوں یا پھر جنگ کریں۔ اب ان میں سے جو کلمۂ شہادت پڑھے اور اس کا اقرار کرے، نماز پڑھے، زکاۃ دے تو اس کی جان و مال دونوں محفوظ ہو جائیں گے، سوائے اس کے کہ اسلامی احکامات کے تحت اس کا مطالبہ ہو، مثلاً قصاص میں قتل کر دیا جانا یا چوری کی سزا میں ہاتھ کا کاٹا جانا وغیرہ۔ اسلام کے دوسرے ارکان میں سے یہاں خاص طور سے نماز اور زکاۃ ہی کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ فرد و معاشرے کو اس کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے کہ نماز بارگاہ خداوندی میں بار بار کی حضوری سے دل کو پاک کرتی رہتی ہے اور زکاۃ سے مال کی پاکی کے ساتھ ساتھ معاشرے میں موجود فقراء و مساکین کی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے" والی حدیث میں گزر چکا ہے کہ جو شخص اس کو دل کے یقین و تصدیق کے ساتھ خلوص نیت کے ساتھ کرے گا وہ مومنین میں شمار ہوگا۔ اب اگر کوئی خدانخواستہ تقیہ کے طور پر یا تلوار کے ڈر سے کرتا ہے تو اس کا حساب خدا پر چھوڑ دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ ظاہر و پوشیدہ دونوں کو جانتا ہے۔

(اِنَّہٗ یَعْلَمُ الْجَھْرَ وَمَا یَخْفٰی۔ الاعلیٰ-۷) حاکم اور مصلح تو ظاہر حال کے مطابق معاملہ کرنے کے مکلّف ہیں۔ شرعی احکام میں اعتبار ظاہر ہی کا کیا جاتا ہے۔

کلمۂ شہادت یعنی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا۔" (الاحزاب-۴۰)

قرآن کریم کی اس حقیقت بیانی کے بعد اب جو بھی نبوت کا دعویٰ کرے گا وہ کافر ہوگا اور جو شخص اس مدعی نبوت کو سچ جانے گا اور اس کی پیروی کرے گا وہ بھی گمراہ اور کافر ہوگا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد ساری نبوتوں کا قیامت تک کے لیے خاتمہ فرما دیا اس کے بعد کسی کے لیے دعویٰ نبوت کی گنجایش نہیں باقی رہی، تمام علماء قادیانیوں کے کفر پر متفق ہیں، جو شخص اس حقیقت سے ناواقف ہو یا جان بوجھ کر اپنے کو ناواقف ظاہر کرے خدا پر جھوٹ باندھتا ہے جیسا کہ غلام احمد قادیانی نے کیا۔

صحیحین کی روایت ہے کہ میری اُمّت میں تین جھوٹے ہوں گے اور ہر ایک اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا، حالاں کہ میں آخری نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی نہ آئے گا۔

آپ کا یہ فرمانا کہ جب وہ ایسا کریں فعل کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ کلمۂ شہادت کا زبان سے ادا کرنا کافی نہیں بلکہ مُراد یہ ہے کہ ان کو یقین آجائے، اور ایمان وہ ہے جو دل میں بیٹھ جائے اور عمل سے اس کی تصدیق ہو۔

(مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کرلیں گے) یعنی اس کے بعد ان سے نہ جنگ کی جائے گی اور نہ ہی کوئی اور تکلیف پہنچائی جائے گی، سوائے کلمۂ شہادت کے عائد کردہ قوانین کے، جیسے قصاص یا رجم جو شادی شدہ زانی پر نافذ ہوگا، بعض لوگوں نے اِلَّا بحقھا میں ضمیر کا مرجع جان ومال کو مانا ہے جس کا مطلب ہوگا جان ومال کو اسلام کی راہ میں لگانے کا۔ جو تقاضا ہے وہ پورا کرنا ہوگا۔ بخاری شریف میں ابن عمرؓ سے مروی

روایت سے جو (الا بحق الاسلام) کے لفظ سے حدیث مذکور میں ہے پہلی صورت مراد لی گئی ہے۔ اور یہ جو روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ رضی اللہ عنہما میں مانعین زکاۃ سے قتال کے بارے میں اختلاف ہوا اور حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ ان لوگوں سے کیسے قتال کریں گے جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، (مجھے لوگوں سے قتال کا حکم ملا ہے جب تک لا الٰہ الا اللہ نہ کہہ لیں جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا اس نے اپنی جان و مال کو محفوظ کر لیا سوائے اس حق کے جو اسلام اس پر واجب کرتا ہے اس کے بعد تو اس کا معاملہ خدا کے حوالے ہوگا) حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: خدا کی قسم میں ان لوگوں سے ضرور جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کریں گے۔ زکوٰۃ مال کا حق ہے، خدا کی قسم اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک رسی بھی دیتے تھے اور اس وقت اس کے دینے سے انکار کریں گے تو میں ان سے جنگ کروں گا، یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا، میں یقینی طور پر سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ کے لیے حضرت ابوبکرؓ کو شرح صدر فرما دیا تھا اس سے میں سمجھ گیا کہ یہی درست ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے جواب میں فرمایا کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "الا بحقہا" نہیں فرمایا ہے، اس کا حق نماز کی پابندی اور ادائے زکاۃ ہے، خدا کی قسم اگر انھوں نے زکاۃ نہ دی تو ان سے جنگ کروں گا۔

کوئی معترض یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ انسان باہم ایک دوسرے کا تعاون کرے، مدد دے سہارا دے تو پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگی اصول کیوں کر مقرر فرمائے، آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہؓ نے جنگیں کیوں کیں، ــ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جنگیں بھی انسانی تعاون کی بنیاد پر تھیں، اس لیے کہ اسلام نے حق پسندوں اور حق کے طلب گاروں پر کبھی تلوار نہیں اُٹھائی۔ بلکہ تلوار ان مظلوم انسانوں کی مدد کے لیے اُٹھانی پڑی جن پر ظالم بادشاہوں نے نہ صرف عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا بلکہ حق کی روشنی بھی ان تک نہ پہنچنے دیتے تھے، لہٰذا تعاون کا یہ تقاضا تھا کہ ظلم کا خاتمہ کیا جائے۔ اور مظلوم و مصیبت کے مارے انسانوں کو جو ظالم حاکموں کی غلامی میں بُری طرح جکڑے ہوئے تھے، ان کو آزادی ملے اور وہ حق

باطل کے بارے میں سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کے لیے آزاد فضا میں سانس لیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ." (الحج ۳۹-۴۰)

جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے ان کو اجازت ہے (کہ وہ لڑیں) کیوں کہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا (ان کی مدد کرے گا وہ) یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے (انھوں نے کچھ قصور نہیں کیا) ہاں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار خدا ہے۔ اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو (راہبوں کے) صومعہ اور (عیسائیوں کے) عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں خدا کا بہت سا ذکر کیا جاتا ہے، ویران ہو چکی ہوتیں، اور جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی ضرور مدد کرتا ہے، بے شک خدا توانا اور بزرگ ہے۔

قرآن کریم کے یہ الفاظ کتنے بلند ہیں! ان پر تقویٰ کی نگہبانی و فرماں روائی ہے قتل اسی کو کیا جائے گا جو خود سے جنگ چھیڑے، رہے کاشت کار اور مزدور طبقے کے لوگ تو ان کو قطعاً کوئی تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ایک لشکر سے فرماتے ہیں: اللہ کے نام پر جاؤ، کسی بچے کو نہ قتل کرنا، عورت کو نہ قتل کرنا، اور نہ کسی مزدور کو قتل کرنا۔ مسلمان جب کسی حکومت پر فوج کشی کرنے پر مجبور ہوتے تھے تو ان کو تین باتوں میں سے کوئی ایک بات اختیار کرنے کی دعوت دیتے تھے، (۱) یا تو وہ اسلام قبول کرلیں (۲) یا مسلمانوں سے معاہدہ کرلیں (۳) یا پھر جنگ کریں۔

ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ جب مسلمانوں کے لشکر نے سمرقند کے علاقہ "صغد" پر حملہ کیا تو ان تین باتوں میں سے کسی بات کی دعوت نہ دی اور فوج کشی کر کے قبضہ کرلیا، جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مبارک عہد آیا تو اہل صغد نے ان سے شکایت کی، ان کی شکایت سُن کر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے سمرقند کے گورنر کو لکھا (جیسے ہی تم کو ہمارا یہ خط پہنچے قاضی کو اس معاملے کی جانچ و تحقیق اور فیصلہ پر مامور کرو، اگر قاضی ان لوگوں کے حق میں فیصلہ دے تو عربوں کو ان کی چھاؤنی سے نکال دو) قاضی نے اہل سمرقند کے حق میں فیصلہ دیا اور اسلامی لشکر شہر سے باہر نکل آیا تا کہ ان پر یہ تینوں شرائط پھر سے پیش کرے۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص ربعی بن عامرؓ کو فارس کی افواج کے کمانڈر رستم کے پاس قادسیہ بھیجتے ہیں، ربعی بن عامرؓ جب رستم کے دربار میں پہنچتے ہیں تو وہ پوچھتا ہے، آپ کس غرض سے آئے ہیں؟ حضرت ربعی بن عامرؓ جواب دیتے ہیں کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے تا کہ اس کے بندوں کو اس کی منشاء کے مطابق بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ (اکیلے اور بے مثل) کی عبادت کی طرف بلائیں، اور دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف لائیں، مذاہب و ادیان کے جور وستم سے نکال کر اسلام کے عدل و انصاف کے سائے میں پہنچائیں، اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنی مخلوق کی طرف اپنا دین دے کر بھیجا ہے تا کہ ہم ان کو اس کی دعوت دیں، جو اس کو منظور کرے گا ہم بھی اس کی بات مان لیں گے اور واپس ہو جائیں گے اور جو اس کا انکار کرے گا ہم اس سے لڑتے رہیں گے حتیٰ کہ اللہ کا وعدہ پالیں۔ ان لوگوں نے سوال کیا اللہ کا وعدہ کیا ہے؟ حضرت ربعی بن عامرؓ نے جواب دیا جو شخص اس دین کا انکار کرنے والوں سے لڑتے ہوئے قتل (شہید) کر دیا جائے اس کے لیے تو جنت کا وعدہ ہے اور جو زندہ رہے اس کے لیے کامیابی و فتح مندی کا وعدہ ہے۔

اس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ جنگیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں، اور آپؐ سے پہلے حضرت موسیٰ، حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہم السلام نے فرمائی ہیں ان سب کا مقصد حق کی مدد و نصرت تھا، اگر یہ نہ کیا جاتا تو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت

نہ ہوتی۔

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز کے وجوب کا اعتقاد رکھتے ہوئے جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والا قتل کر دیا جائے گا اور یہی جمہور کا قول ہے، لیکن یہاں یہ استدلال صحیح نہیں، اس لیے کہ یہاں حکم قتال کا ہے، قتال یعنی جنگ کے مباح ہونے سے قتل نہیں مباح ہوگا، اس لیے کہ باب مفاعلہ سے قتل کا دونوں طرف سے صادر ہونا ضروری ہوتا ہے، جنگ اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ نماز کے چھوڑنے اور زکوٰۃ کے نہ دینے والے لوگ آمادۂ جنگ نہ ہوں یعنی مدافعت میں جنگ کے لیے تیار ہو جائیں اور یہ کہ ایک جماعت اس پر متفق ہو جائے کہ وہ نہ نماز پڑھے گی نہ زکوٰۃ دے گی اور اس پر جنگ کرنے پر آمادہ ہو جائیں، لیکن بلا نیت جنگ و مخالفت نماز چھوڑنے والے یا زکوٰۃ نہ دینے والے سے جنگ یا اس کو قتل کرنا درست نہ ہوگا۔

بہت سے علماء سلف کی رائے ہے جن میں امام ابو حنیفہ اور امام شافعی وغیرہ بھی شامل ہیں کہ تارک صلوٰۃ کو کافر نہ قرار دیا جائے گا بلکہ فاسق قرار دیا جائے گا، اس کو توبہ کے لیے کہا جائے گا، اگر توبہ نہ کرے تب بطور تعزیر و سزا کے قتل کیا جائے گا، یہ امام مالک اور امام شافعی کا مسلک ہے، امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ قتل نہ کیا جائے گا، بلکہ اس کو سزا دی جائے گی قید کر دیا جائے گا حتیٰ کہ نماز پڑھنے لگے۔

جن احادیث سے تارک نماز کا کفر ثابت ہوتا ہے اس سے مُراد نماز کا منکر یا اس کے چھوڑنے کے سلسلے میں حیلہ بہانا کرنے والا شخص مراد ہے۔ بعض قرآنی آیات بھی اس کے مخالف ہیں، مثلاً:

"إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ۔" (النساء - ۱۱۶)

خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا (کوئی گناہ)، جس کو چاہے گا بخش دے گا۔

ہاں اگر کوئی نماز کا انکار کرتا ہے اور اس کو نادرست کہتا ہے تو وہ تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر کافر ہوگیا اور اسلام سے نکل گیا۔

اور زکاۃ کے وجوب کا بھی اگر کسی نے انکار کیا تو وہ اسلام سے خارج ہوگیا وہ کافر قرار پائے گا اور قتل کر دیا جائے گا، لیکن کسی نے زکوٰۃ کی ادائی تو نہ کی لیکن اس کی فرضیت کو تسلیم کرتا ہے تو وہ زکاۃ نہ ادا کرنے کی وجہ سے گنہ گار تو ہوگا لیکن اسلام سے خارج نہ ہوگا، حاکم زبردستی اس سے زکاۃ وصول کرے گا اور سزا دے گا اور اگر پوری قوم زکاۃ ادا کرنے سے باز رہی جب کہ وہ زکاۃ کی فرضیت کو تسلیم بھی کرتے ہوں اور ہوں وہ لوگ صاحب قوت و طاقت، تو ان سے بھی جنگ کی جائے گی حتیٰ کہ زکاۃ ادا کریں۔ حدیث میں علماء کی مزید تحقیقات اور بحثیں ہیں۔

امام شوکانیؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ تارک صلوٰۃ کافر ہے اس پر حد جاری کی جائے، وہ قتل کر دیا جائے گا۔ دلیل اسی حدیث سے اور بعض دیگر احادیث سے پیش کرتے ہیں۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام تلوار اور قتل و خوں ریزی سے نہیں پھیلا، مجاہدین کی دعوت اور لوگوں کو ضلالت و گمراہی سے نکالنے اسلام کے ارکان و اصول کو واضح کرنے کی راہ میں جب رکاوٹ ڈالی گئی اور کوئی قوم مقابلے میں آئی تب وہ جنگ پر مجبور ہوئے۔

۲۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان دنیا کے گوشے گوشے میں دین پھیلانے کا عزم و حوصلہ رکھیں، خواہ فرد ہو یا جماعت یا حکومت اپنے اپنے وسائل و امکانات کے اعتبار سے یہ سب کے لیے ضروری ہے خواہ ان کو جنگ ہی پر کیوں نہ مجبور ہونا پڑے۔

۳۔ حدیث سے رہ نمائی ملتی ہے کہ ہر مسلمان اپنے کو دعوتِ دین کے لیے تیار کرے، حکومت اس دعوت کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار رہے، موجودہ حالات میں یہ بات اسی وقت ممکن ہوگی جب کوئی شخص فکری، علمی اور روحانی طور پر اپنے کو تیار کرے اور جسمانی قوت و طاقت بھی بڑھائے، آج مسلمانوں کو اس آیت کریمہ پر غور کرنے کی کتنی شدید ضرورت ہے:

"وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔" (انفال۔۶۰)

اور جہاں تک ہوسکے (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لیے مستعد رہو، کہ اس سے خدا کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر ہیبت بیٹھی رہے گی۔

١٩

مواخات - اسلامی معاشرے کا امتیاز

عن أبی موسیٰ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : المؤمن للمؤمن کالبنیان، یشدّ بعضہ بعضاً، و شبّک بین أصابعہ - (رواہ البخاری)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ایمان والوں کا تعلق باہم ایک دوسرے کے لیے ایک مضبوط عمارت کے اجزاء کا سا ہونا چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کی مضبوطی کا ذریعہ بنتے ہیں، (اور ان کے جڑے رہنے سے عمارت کھڑی رہتی ہے) آپ نے (ایمان والوں کے اس باہمی تعلق کا نمونہ دکھانے کے لیے) اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال دیں (اور بتایا کہ مسلمان کو اس طرح باہم مل کر ایک ایسی دیوار بن جانا چاہیے جس کی اینٹیں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہوں اور کہیں ان میں کوئی خلا نہ ہو)۔

وادیٔ مکہ میں جس وقت اسلام کی کرنیں پھوٹیں، عرب لوٹ مار جیسی بد ترین بُرائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے، ناانصافی اور ظلم ان کے خمیر میں اس طرح داخل ہو گیا تھا کہ قبیلے ایک دوسرے پر شب خوں مارتے، کبھی یوں ہی بلا سبب زور زبردستی سے اور کبھی کسی معمولی بات پر یا پانی اور چراگاہ کے بارے میں اختلاف ہو جانے کے

باعث جنگ چھڑجاتی اور کشت وخون کا بازار گرم ہو جاتا، ان کا ایک نہایت بڑا عیب قبائلی تعصب تھا جس نے ان کا شعار یہ بنا دیا تھا کہ اپنے بھائی کی ہر حال میں مدد کرو۔ ظالم ہو تب بھی، مظلوم ہو تب بھی:

أنصر أخاك ظالمًا أو مظلوما۔

اس عہد جاہلی کا عرب اپنے قبیلے ہی کے دین کا پیرو رہتا تھا، خواہ غلط ہو یا صحیح، جاہلی شاعر درید بن الصمہ کہتا ہے ؎

وما أنا إلا من غزية إن غوت
غويت وإن ترشد غزية أرشد

میں تو غزیہ ہی کا ایک فرد ہوں۔ اگر غزیہ کے لوگ غلط راہ چلیں گے تو میں بھی غلط ہی راہ پر چلوں گا اور اگر وہ نیک راہ پر چلیں گے تو میں بھی نیک راہ پر چلوں گا۔

یہی ماحول اور فضا تھی کہ اسلام کی روشنی چمکی، فضا بدلی اور باہمی نفرت و عداوت دور ہوئی، دلوں کا کینہ کافور ہوا اور سب بھائی بھائی بن گئے۔ قرآن کریم نے ان کو اس طرح مخاطب کیا:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا۔ (آل عمران - ۱۰۳)

"اور سب مل کر اللہ کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑ لو اور متفرق نہ ہو جاؤ اور خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے۔"

اسلام نے ان عربوں کی ایک متحد و منظم قوم تیار کر دی۔ وہی لوگ جو کل ایک

دُوسرے کے خون کے پیاسے تھے ایک متحدہ مسلمان لشکر میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور اسلام کا جھنڈا بلند کرتے ہیں، جب یہ منتشر طاقتیں متحد ہوگئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا:

"مسلمان مسلمان کے لیے پختہ مکان کے مانند ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو جوڑے ہوئے اور مضبوط کیے ہوئے ہے۔"

اس ارشاد کے ذریعے آپؐ نے تمام بُری عادتوں اور قبائلی فخر و مباہات کو ختم فرما دیا اور جاہلی معاشرے کے تمام غلط معیار اور پیمانوں کو حقیقی بھائی چارگی اور برادرانہ تعلقات کے پیمانوں میں تبدیل کر دیا،

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ۔ (حجرات - ۱۰)

"مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔"

فرمایا:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ۔۔ (حجرات - ۱۳)

"اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔"

ایک پرہیزگار و متقی کالا حبشی، کافر ہاشمی سے باعزت و معزز قرار پایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت کی تھوڑے تھوڑے وقفے سے تجدید فرماتے رہتے تھے، چناں چہ آپ فرماتے ہیں:

المسلم أخو المسلم لا يظلمه ولا يسلمه، من كان في حاجة أخيه كان الله في حاجته، ومن فرّج عن مؤمن كربة فرّج الله عنه بها كربة من كرب يوم القيامة ومن ستر مسلماً ستره الله يوم القيامة۔ (متفق علیہ)

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔ تم میں جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پُوری کرنے میں لگا رہے گا تو اللہ تعالیٰ

اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا اور جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں قیامت کی کسی تکلیف سے اس کو نجات دے گا اور جو مسلمان کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔"

دوسری حدیث میں فرمایا:

المسلم أخو المسلم لا یخونه ولا یکذبه ولا یخذله کل المسلم علی المسلم حرام، عرضه وماله ودمه، التقویٰ ھٰھنا، بحسب امرئ من الشرّ أن یحقر أخاه المسلم۔

"ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس سے خیانت کرے، نہ اس سے جھوٹ بولے اور نہ اس کو بے مدد کے چھوڑے (جب وہ اس کی مدد کا محتاج ہو)۔ مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لیے قابل احترام ہے، اس کی عزت، اس کا مال، اس کا خون (اس لیے ناحق اس کا خون گرانا، اس کا مال لینا، اس کی آبرو ریزی کرنا یہ سب حرام ہے)۔"

اس بھائی چارے نے اسلامی لشکر کی صفوں کو ثابت قدم اور قوی بنانے میں بڑا اہم رول ادا کیا کہ ایک مسلمان دس کافروں کے مقابلے میں کافی تھا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۔ (انفال۔۶۵)

"اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو کافروں پر غالب رہیں گے۔"

مسلمانوں کا باہمی ربط و تعلق اور بھائی چارہ دیوار کی طرح ہونے کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے تاریخ اسلام کا یہ واقعہ پڑھیے جو اسلامی اخوت کی عملی تصویر پیش کرتا ہے حضرت حذیفہؓ عدوی بیان کرتے ہیں کہ:۔

جنگ یرموک کے موقع پر میں اپنے چچازاد بھائی کی تلاش میں زخمیوں میں پھر رہا تھا، ساتھ میں پانی بھی لے لیا تھا کہ اگر زندگی کی کچھ رمق باقی ہوگی تو پانی پلاؤں گا، جب میں میدان میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ زخمیوں میں پڑے ہوئے ہیں، ان کی سانس اُکھڑ گئی ہے آخری وقت ہے، اس حال میں پانی ان کے منہ کے قریب لے گیا، پانی کا ان کے منہ کے قریب پہنچنا تھا کہ دُوسرے زخمی کے کراہنے کی آواز آئی، میرے بھائی نے اپنا منہ بند کرلیا اور اشارہ کیا کہ اس دوسرے زخمی کو پانی پلاؤں، دوسرے زخمی کے پاس پہنچا تو وہ ہشام بن العاص رضی اللہ عنہ تھے، ہم نے ان کو پانی پلانا چاہا کہ اتنے میں تیسرے زخمی کے کراہنے کی آواز آئی، اس آواز کا آنا تھا کہ ہشام نے منہ بند کرلیا اور اشارہ کیا کہ پہلے ان کو پانی پلاؤں، ان کے پاس گیا، قبل اس کے ان کو پانی پلاؤں انھوں نے دم توڑ دیا، اب میں ہشام کے پاس واپس آیا تو دیکھا کہ وہ جاں بحق ہو چکے ہیں، ان کے پاس سے اپنے چچازاد بھائی کے پاس آیا کہ ان کو پانی پلا دوں، پہنچا تو وہ بھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، پانی ویسے کا ویسا ہی لیے ہوئے واپس آگیا۔

مسلمان جاہلی رجحانات، غرور و تکبّر اور مادہ پرستی کی اس پستی سے نکل کر بھائی چارے اور باہم روحانی ربط و تعلق اور ایمانی میل ملاپ کی اس بلندی کو پہنچ گئے جس کا ایک نمونہ اوپر مذکور اس واقعہ میں نظر آتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد:

"مسلمان مسلمان کے لیے عمارت کی طرح ہے کہ اس کا ایک حصّہ دوسرے حصّے کو جوڑتا ہے۔"

کا یہی مطلب تھا جس کی ایک جھلک اس واقعے میں نظر آئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوی تربیت کے ثمرات تھوڑی سی مدت میں باہمی اتحاد و محبت اور ایثار و قربانی کے اس بلند معیار کو پہنچ گئے کہ ہر ایک دوسرے کو اپنے سے زیادہ مستحق سمجھنے لگا اس لیے کہ وہ سب

کے سب ایک جسم کی طرح بن گئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر جو مثال بیان فرمائی اوپر کا واقعہ اس کی روشن مثال پیش کرتا ہے، اس تشبیہ کا مقصد باہم اتحاد اور ایک دوسرے کی فکر و دیکھ بھال تھی۔

حدیث کا فقہی پہلو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل میں کہ آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے مثال دے کر سمجھایا، اس سے اس بات کا جواز نکلتا ہے کہ تشبیک بین الاصابع یعنی ایک ہاتھ کی اُنگلیوں کو دُوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کرنا جائز ہے خواہ مسجد کے اندر ہو یا کسی اور جگہ، اس لیے کہ حدیث مذکور میں مطلقاً تشبیک کا لفظ آیا ہے کوئی قید نہیں ہے مگر مسجد کے اندر اور نماز کی حالت میں تشبیک بین الاصابع کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، علامہ ابراہیمؒ نماز کے اندر اس کو مکروہ کہتے ہیں، امام مالکؒ کا بھی یہی قول ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے عاصمؓ اور حضرت حسن بصریؒ نے اس کی رخصت دی ہے۔

کئی حدیثوں میں اس کی ممانعت مذکور ہے حاکم نے اپنی مستدرک میں حضرت ابوہریرہؓ کے حوالے سے نقل فرمایا ہے، فرمایا "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی اپنے گھر میں وضوء کرے پھر مسجد آئے تو جب تک گھر نہ واپس ہو نماز ہی میں ہوتا ہے، لہٰذا ایسا نہ کرے اور اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر کے عملی طور پر دکھایا کہ ایسا نہ کرے۔" حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور شیخین کے معیار پر ہے، اس کی ممانعت ایک اور حدیث میں بھی منقول ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم نماز میں کھڑے ہو تو ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل نہ کرو کہ ایسا کرنا شیطان کا کام ہے۔ اور تم جب تک مسجد سے باہر نہیں نکلتے ہو نماز ہی میں ہوتے ہو (یعنی نماز پڑھنے کا

ثواب ملتا رہتا ہے)۔

ابن منذرؒ کہتے ہیں کہ ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں، آپؐ کا منع کرنا اس بنیاد پر ہے کہ بلا وجہ محض تفریحاً ایسا نہ کرنا چاہیے اور حدیث میں جس تشبیک کا ذکر ہے اس سے مقصود مثال دے کر پوری تصویر کشی کر کے سمجھانا ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ تمام مسلمان باہم مل جل کر محبت واخوت کے ساتھ رہیں۔

۲۔ مسلمان اپنے بھائی کے حقوق کا خیال رکھے یعنی مریض کی عیادت کرے، جنازے کے ساتھ جائے، چھینکنے والے کی چھینک پر یرحمک اللہ کہے، سلام کا جواب دے، مظلوم کی مدد کرے، دعوت قبول کرے، اپنے بھائی کی قسم پوری کرے۔

۳۔ حدیث، حضور صلی اللہ علیہ کے ارشاد کی وضاحت کرتی ہے کہ تم مومن کامل نہیں ہو سکتے جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی نہ پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو۔

حاصل یہ ہے کہ دنیا کے مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی لینا اور ان کی مشکلات میں مثبت حصّہ لینا اور ان کی خوشیوں میں شریک ہونا یہی معنی ہیں بنیانٌ مرصوص کے، ان چیزوں میں کوتاہی اور کمی اخوت کی کمزوری ہے۔

۲۰

رشوت معاشرے کے لیے مہلک مرض

عن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما قال: لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم الرَّاشِیَ وَالْمُرْتَشِیَ ۔ (رواہ احمد)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے۔ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرے کی اصلاح، حق کو پھیلانے اور جاہلیت کے اثرات کو مٹانے کے لیے مختلف طریقے اختیار فرمائے، ان طریقوں میں سب سے پہلا طریقہ معاشرے میں بھائی چارگی، میل ملاپ، دوسرے کی خدمت اور مسلمان بھائی کی مدد تھا، اس کی اتنی تاکید فرمائی کہ آپؐ نے ان باتوں کو صدقے میں شمار فرمایا تاکہ مسلمانوں میں اس کا شوق پیدا فرمائیں اور ان کاموں میں ان کی ہمت اور ان کے حوصلے کو بڑھائیں۔

چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہارا اپنے بھائی سے بشاشت اور مسکراہٹ کے ساتھ ملنا صدقہ (کا ثواب رکھتا) ہے۔"

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ ہم باہم ایک دوسرے کی مدد کریں ہر مسلمان کی مدد کریں اور اس کو سہارا دیں اور اپنے دل میں خود غرضی اور مادی فائدہ اُٹھانے کے جذبات کو نہ داخل ہونے دیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے کو رحمت سے محروم اور دور رہنے کی بد دعا دی ہے۔ راشی یعنی رشوت دینے والا وہ شخص ہے جو رشوت و خوشامد کے طور پر کسی شخص کو کوئی چیز (مال روپیہ وغیرہ) دے کہ وہ اس

رشوت کے بدلے میں دوسرے کا حق مار کر اس کو دے دے۔

اسی طرح سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے والے پر بھی لعنت فرمائی ہے کہ وہ بلا کسی استحقاق کے یہ مال لیتا ہے۔ لوگوں کا مال غلط اور ناجائز طریقے سے حاصل کرتا ہے اور ناجائز طریقے سے لوگوں کا مال حاصل کرنا، اس میں ہر وہ صورت شامل ہے جو شرعی اصول و احکام کے خلاف ہو۔ اس میں دھوکا، رشوت، جوا، ذخیرہ اندوزی کر کے نفع اٹھانا سبھی کچھ شامل ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات پر عمل کرنے سے معاشرہ فساد، بگاڑ، بغض اور کینے سے پاک ہو جائے گا اور مسلمانوں کے دل ایک دوسرے سے قریب اور مانوس اور ہر قسم کی کھوٹ سے پاک ہو جائیں گے، یہاں تک کہ مسلمان معاشرہ صاف ستھرا اور میل محبت کا مثالی معاشرہ بن جائے گا۔

اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام صورتوں کو منع فرما دیا جو رشوت بن سکتی ہیں، چناں چہ آپ نے ایسے ہدایا قبول کرنے سے بھی منع فرما دیا جن میں ذرا بھی رشوت کی صورت پیدا ہوتی ہو، ابو حمید ساعدی روایت فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ازد کے ایک شخص ابن لتبیہ کو صدقہ وصول کرنے پر مامور فرمایا، جب وہ وصولی کر کے واپس ہوئے تو کہا کہ یہ تمہارا (یعنی بیت المال کا) ہے اور یہ ہم کو ہدیہ ملا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ وہ اپنے باپ یا ماں کے گھر میں کیوں نہ بیٹھا رہا، پھر دیکھتا کہ اس کو ہدیہ کیا جاتا ہے کہ نہیں، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کوئی شخص اس (صدقہ) میں سے جو کچھ بھی لے گا، قیامت کے دن اس کو اپنی گردن پر لادے ہوئے لے کر آئے گا، اونٹ ہوگا تو وہ آواز نکال رہا ہوگا، بیل ہوگا تو وہ بول رہا ہوگا، بکری ہوگی تو وہ چلاّ رہی ہوگی، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھائے اتنا کہ آپ کے بغل کے بال نظر آنے لگے اور آپ نے تین مرتبہ فرمایا کہ اے اللہ ہم نے پہنچا دیا ہم نے

پہنچا دیا۔

اپنے اس ارشاد کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا ضروری اور اہم اصول بتا دیا جس کے ذریعے معاشرے کے حقوق محفوظ ہو جاتے ہیں عامل کے لیے یہ بات آپؐ واضح فرما دیتے ہیں کہ اس کے لیے کیا لینا جائز اور حلال ہے اور کیا نہیں، آپؐ نے ان منافذ اور چور دروازوں کو بند فرما دیا۔ جو رشوت کا شبہ تک پیدا کرتے ہوں، چناں چہ آپؐ نے قرض دینے والے کو مقروض کا ہدیہ تک قبول کرنے سے منع فرمایا کہ کہیں یہ سود و ربا میں نہ شمار ہو۔ کسی کا کوئی کام کر دینے کے بعد اس کا ہدیہ بھی قبول کرنے سے منع فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس محتاط رویّے کے ذریعے ہدیہ اور رشوت کے فرق کو واضح کر دیا، ہدیہ جائز ہے۔ ہدیہ وہ ہے جو آدمی اپنے بھائی کو کسی رشتے کی وجہ سے یا دوستی کے سبب یا محض اس کی محبت بڑھانے کے لیے دیتا ہے بشرطے کہ اس سے اپنی کسی غرض کا حاصل کرنا مقصود نہ ہو یا کسی ضرر سے بچنا مقصود نہ ہو۔

اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روایت میں ارشاد فرمایا: آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو کہ ہدیہ دل کے کینے کو ختم کر دیتا ہے۔ اور کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے ہدیے کو قطعاً حقیر نہ سمجھے خواہ بکری کا کھُر ہی کیوں نہ ہو، اسلوبِ کلام بتا رہا ہے کہ جس کو ہدیہ دیا جائے وہ بھی ہدیہ دے تاکہ دلوں میں خلوص پیدا ہو، محبت بڑھے اور بھائی چارگی کا چلن عام ہو

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اللہ کے رسولؐ! اگر کوئی شخص آ کر ہمارا مال چھینے تو ہم کیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا، اپنا مال اس کو نہ دو، اس شخص نے عرض کیا اگر وہ۔ مجھ سے قتل و قتال کرنے لگے تو کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا تم اس سے لڑو، پھر اس شخص نے کہا، اللہ کے رسولؐ! اگر ہم قتل کر دیے گئے تو؟ آپؐ نے فرمایا، اگر تم قتل کر دیے جاؤ گے تو شہادت نصیب

ہو گی پھر اُس شخص نے کہا اگر ہم نے اس کو قتل کر دیا تو ؟ آپ نے فرمایا وہ جہنم میں داخل ہو گا۔

حلال اور شرعی طریقے پر حاصل کیے ہوئے مال کی اہمیت کو اسلام اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے۔ ان ساری تفصیلات سے معلوم ہوا کہ حکام اور دعوت کا کام کرنے والوں کو رشوت خوری اور مسلمان معاشرے پر پڑنے والے اس کے برے اثرات کو بیان کرنا چاہیے۔

مسلمانوں میں بھائی چارگی میل محبت اور باہمی اتحاد پیدا کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مختلف انداز اور نہایت خوب صورت پیرایۂ بیان کے ساتھ آئے ہیں جو اُن تمام راستوں کو کاٹ دیتے ہیں جو باہم بغض و عداوت اور معاشرے میں انتشار پیدا کرتے ہیں، رشوت دینے اور رشوت لینے والے پر آپؐ کا لعنت فرمانا بالکل سچ ہے۔

حدیث کا فقہی پہلو

رشوت جائز نہیں، رشوت وہ رقم یا مال ہے جو حاکم یا افسر یا کسی صاحبِ اختیار کو اس لیے دیا جائے کہ وہ اس کے حق میں وہ فیصلہ دے دے جس کا اسے حق نہیں پہنچتا، یا اس کو کہیں کا والی اور افسر مقرر کر دے، ملازم رکھ دے ـــ یا اس کے واسطے کسی دوسرے پر ظلم کرے ان تمام صورتوں میں لینے والے اور دینے والے دونوں کو گناہ ہے۔ ہاں ایسا شخص جس کا حق نہیں مل رہا ہے روک لیا گیا ہے تو اس ظلم سے بچنے اور اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اگر وہ رشوت دے تو اس کے لیے مباح ہے لیکن لینے والا گنہ گار ہوگا۔ ان دونوں صورتوں میں دینے والے کا مال اسی کی ملکیت میں باقی رہے گا جیسا کہ پہلے تھا بالکل ایسے ہی جیسے غصب کا مال، رشوت اور غصب کے مال میں کوئی فرق نہیں، ایسے ہی وہ مال جو دارالکفر کے لوگ قیدیوں کے فدیے اور

دوسری ضرورتوں میں دیتے ہیں، اس طرح کی اور دوسری شکلیں بھی اسی حکم میں شامل ہیں۔ اس کی دلیل یہ قرآنی ارشاد ہے:

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔

ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ، ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو اور اس سے مالی فائدہ ہو جائے تو وہ جائز ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی اسی کی دلیل ہے فرمایا:

"تمہارے خون، تمہارے مال تم پر حرام ہیں۔"

یعنی بلا شرعی حق کے کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو جانی یا مالی نقصان پہنچانے کا کوئی حق نہیں رکھتا، ایسا کرنا گناہِ عظیم ہے۔

شیخ ابوسلیمان کے نزدیک رشوت دینے والے اور لینے والے اگر دونوں اپنی نیت اور ارادے میں برابر ہیں تو دونوں سزا کے مستحق ہوں گے، لیکن اگر رشوت دینے والے نے اپنا حق حاصل کرنے کے لیے رشوت دی ہے تو وہ اس وعید میں شامل نہیں ہوگا۔

حضرت حسن، شعبی، جابر بن زید اور عطاء، ان سب حضرات سے مروی ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنے جان و مال کے بارے میں ظلم کا خطرہ ہو تو اس ظلم سے بچنے کے لیے رشوت دینے میں حرج نہیں ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ شریعتِ اسلامی کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسان کو انسان کے ظلم سے بچاتی ہے اور اس کے لیے بہت باریک بینی کے ساتھ اس کے اصول اور ضابطے بنائے گئے ہیں، لہذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ رشوت سے بچے اور دوسرے کو بھی اس سے ڈرائے اور بچائے

تاکہ بھائی چارگی، محبت، آپسی لین دین سب کچھ اللہ ہی کے واسطے ہو جائے، اس میں خواہشات نفسانی اور ذاتی غرض کا کوئی دخل نہ ہو۔

۲۔ حاکم اس شخص کا محاسبہ کرے جو مسلمانوں کے معاملات کا ذمّہ دار ہو تاکہ اس کی غلطی کو پکڑے اور غفلت کی نشان دہی کرے۔ رعیت حاکم کے ظلم سے محفوظ و مامون ہو جائے اور عامل اور کارکنانِ حکومت غلط فائدہ اُٹھانے سے باز رکھے جائیں۔

۳۔ رشوت گناہِ کبیرہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لعنت فرمانا ہی اِس کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ یہی مفہوم اس قول کا بھی ہے کہ کبیرہ وہ گناہ ہے جو لعنت یا غصّے یا آگ پر ختم ہوا ہو۔

———— ٭ ————

۲۱

اسلام میں سود حرام ہونے کی حکمت و مصلحت

عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ قال: "لعن رسول اللہ صلعم آکل الربا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ، وقال: ھم سواء۔" (رواہ مسلم)

حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے، فرمایا: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے اور اس کی لکھا پڑھی کرنے والے اور اس کے دونوں گواہوں پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا (یہ سب گناہ میں) برابر ہیں۔

اسلام نے جاہلیت کی جن باتوں کو غلط قرار دیا ہے، ان میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں سُود کی جتنی بُرائی بیان فرمائی اور الفاظ و معانی دونوں اعتبار سے اس پر جتنی وعید فرمائی ہے، اسی طرح قرآنی آیات میں سود کے سلسلے میں جتنی سخت وعید آئی ہے اتنی کسی اور چیز کی نہیں، اس کا راز کیا ہے؟

اسلام اپنا اقتصادی نظام بلکہ زندگی کا پورا نظام ہی ایک خاص عقیدے پر قائم کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کائنات اور انسان کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جو ہر عیب و نقص سے پاک ہے اس نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے اور زمین کے اندر رزق، طاقت و صلاحیت اور ضروریات زندگی کا جو بھی ذخیرہ رکھا ہے، انسان کو اس پر اس بنیاد پر قدرت اور اختیار عطا کیا ہے کہ مومنین خدا کے واسطے ایک دوسرے کی کفالت کریں، ان کی ضرورتیں پوری کریں اور ایک دوسرے کے ولی اور دوست بنیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جو رزق عطا فرمایا ہے، اس کا صحیح اور پورا پورا فائدہ اس طور پر حاصل کیا جائے کہ ایک دوسرے کی ضروریات کا خیال رہے، بھائی چارے کے جذبات سے دل اُمنڈ رہے ہوں، اسی کے ساتھ ساتھ مسلمان کے لیے یہ بھی

ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اپنے مال کو بڑھانے اور ترقی دینے میں ایسے ذرائع اور وسائل نہ اپنائیں جن سے دوسروں کو تکلیف اور نقصان پہنچے، اسلام نے اقتصادیات کا ایسا قانون و ضابطہ بنا دیا ہے جس نے ہر صاحبِ قدرت کے لیے اقتصادی کاموں اور حصولِ رزق کی صورتوں کو آسان بنا دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مال و دولت کو اہل مال کے مابین تقسیم کرنے کی بہتر شکلیں مقرر کی ہیں اور اس کے لیے متعدد ذرائع اختیار کیے ہیں۔

کبھی زکوٰۃ فرض کرنے کی شکل میں جس کو اسلامی حکومت وصول کرے گی جو قانون خداوندی کو نافذ کرنے کی ذمے دار ہے اور پھر اس زکوٰۃ کو اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں خرچ کرے گی اور کبھی صرف اللہ کے واسطے اس کے نیک بندے خیر خیرات کے طور پر اپنے ضرورت مند بھائیوں پر خرچ کریں گے جو محض برادرانہ اور بھائی چارگی کے جذبہ سے ہوگا، جس کی ترغیب قرآن کریم نے اس طرح دی ہے اور خرچ کرنے والوں کو شوق دلایا ہے:

مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (البقرہ ۲۶۱-۲۶۲)

"جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان (کے مال) کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک بال میں سو سو دانے ہوں اور خدا جس کے مال کو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے۔ وہ بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے، جو لوگ اپنا مال خدا کے راستے میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے بعد نہ اس خرچ کا کسی پر

احسان جتاتے ہیں اور نہ کسی کو تکلیف دیتے ہیں ان کا صلہ ان کے پروردگار کے پاس تیار ہے اور (قیامت کے روز) نہ ان کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔"

دوسری آیت میں اس طرح فرمایا:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (البقرہ-۲۷۲)

"(اے محمد) تم ان لوگوں کی ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہو بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے اور (مومنو!) تم جو مال خرچ کروگے تو اس کا فائدہ تمہیں کو ہوگا اور تم جو بھی خرچ کرو خدا کی خوشنودی کے لیے کرو اور جو مال تم خرچ کروگے، وہ تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارا کچھ نقصان نہیں کیا جائے گا۔"

یہ ہے مومن کی شان کہ وہ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے سوا اس کا کوئی اور مقصد نہیں ہوتا، نہ خواہش نفس کی تکمیل مقصود ہوتی ہے نہ کسی کو دکھانا اور شو کرنا، یہ بات مومن کے علاوہ کسی اور قوم میں نہیں پائی جاتی۔

اسی طرح سے اسلام نے معاشرے کے افراد میں اخوّت و محبت پیدا کرکے معاشرے کو آگے بڑھانے اور ترقی کی راہ پر چلنے پر زور دیا ہے اور اس کے لیے مختلف طریقے اپنائے ہیں۔ انھیں طریقوں میں سے صدقہ، زکوٰۃ، ایثار و قربانی ہے، سُود کی مخالفت و ممانعت بھی اسی میں شامل ہے جو بخل و گندگی، انفرادی نفع خوری اور مومن سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی بدترین صورت ہے جس میں مقروض کے گاڑھے پسینے کی کمائی کو وہ قرض سے بڑھا کر لیتا اور اس کا حق مارتا ہے۔ اس کے برخلاف صدقے میں

مومن بندہ بلا کسی عوض اور بدلے کے اپنا مال خرچ کرتا ہے، جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ثواب کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ موجودہ معاشرے میں دو متضاد اور ایک دوسرے کے مخالف نظام چل رہے ہیں۔ اسلامی نظام اور سودی نظام دونوں دو الگ الگ نظام ہیں جو جمع نہیں ہو سکتے، نہ کسی اصول میں متفق ہو سکتے ہیں، دونوں کا مقصد زندگی بالکل الگ ہے جو دوسرے سے ٹکراتا ہے۔ سودی نظام اصلاً اس بنیاد پر قائم ہے کہ ہر شخص مال حاصل کرنے کے ذرائع اپنانے میں آزاد ہے، اس سلسلے میں وہ خالق کائنات کی طرف سے کسی عہد و شرط کا پابند نہیں۔ لہٰذا اگر وہ لاکھوں انسانوں کو نقصان پہنچا کر اپنے مال اور خزانے میں اضافہ کرتا جائے تو اس میں اس کو ذرا باک نہیں۔ ایسے شخص سے خدا و رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہوا اور اللہ کے رسولؐ سود کھانے والے، کھلانے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت بھیجیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ۔ (البقرہ-۲۷۹)

"مومنو! خدا سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) خدا اور رسول سے جنگ کرنے کے لیے (تیار ہوتے ہو) اور اگر توبہ کر لو گے (اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان ہے اور نہ تمہارا نقصان۔"

سودی نظام سے اور سود خوری سے معاشرے پر جو تباہ کن اثرات پڑتے ہیں اگر ہم ان کا جائزہ لیں اور غور کریں تو اللہ اور اس کے رسولؐ کا سود خور پر لعنت بھیجنا قطعاً تعجب خیز نہیں۔ چند کھلی ہوئی عام باتیں ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔

سُود کا نقصان نفسیاتی طور پر

نفسیاتی طور پر سود لینے والے کے اندر خود غرضی اور انانیت پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ اپنی ذات وفائدے کے علاوہ کسی اور کی کوئی فکر نہیں کرتا، ہر وقت اپنے ہی مفاد کی فکر میں رہتا ہے۔ یہ جذبہ اس اخوت و محبت کے قطعاً خلاف ہے جس کو اسلام "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" (مسلمان باہم بھائی ہیں) کہہ کر معاشرے میں پھیلانا چاہتا ہے۔ دوسری طرف یہ کہ سُود مقروض کے دل میں قرض دینے والے کی طرف سے بغض و کینہ پیدا کرتا ہے کیوں کہ وہ اس کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اسے مزید پریشانی اور زیر باری میں ڈال دیتا ہے۔

معاشرتی اعتبار سے

سود معاشرے کے افراد میں عداوت ودشمنی کو بڑھاتا ہے جو معاشرے میں فساد اور بگاڑ کا سبب بنتا ہے، جب کہ اسلام باہم میل محبت اور اتفاق و اتحاد پیدا کرنا چاہتا ہے اس لیے کہ اسلام کی نظر میں تمام مسلمان باہم میل و محبت اور ہمدردی کے اعتبار سے ایک جسم کی طرح ہیں کہ جسم کے کسی ایک حصّے میں تکلیف ہو تو اس کی تکلیف پورے جسم کو محسوس ہوتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فالمسلمون کالجسد الواحد اذا اشتکی منہ عضو تداعت لہ سائر الأعضاء بالسھر والحمّٰی۔

"مسلمان ایک جسم جیسے ہیں کہ اگر اس کے کسی عضو میں تکلیف ہو تو سارے اعضائے جسم بے خوابی اور تپش میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔"

اقتصادی اعتبار سے

اقتصادی طور پر سود لینے والا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، لہٰذا مال کو روکے رکھتا ہے کہ جب کاروبار تجارت میں مشکلات پیدا ہوں، چیزیں مہنگی ہو جائیں تب یہ اس کو منہ مانگے فائدے کے ساتھ بیچے، مزید یہ کہ تمام کاروباری لوگ اور مل مالکان اور ان کے کارکنان، بینکوں اور صاحب ثروت لوگوں کے ملازم و مزدور بن جاتے ہیں، قرآن کریم سود کی اسی وجہ سے سخت مذمت کرتا ہے اور سود خوروں کی ایسی مثال پیش کرتا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، قرآن کہتا ہے:

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ۔ (البقرہ - ۲۷۵)

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اُٹھیں گے جیسے کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طرح سے مختلف انداز میں مختلف موقعوں پر سود کی شناعت اور بُرائی بیان فرمائی ہے، ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا: "جس قوم میں سود کا چلن ہو جائے گا وہ قحط کے عذاب میں مبتلا ہوگی اور جس قوم میں رشوت پھیلے گی ان پر رعب طاری کر دیا جائے گا۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "معراج کی رات میں ایسے لوگوں کے پاس سے گزرا جن کے پیٹ (بڑے بڑے) گھر جیسے تھے اور ان میں سانپ تھے جو پیٹ کے باہر سے نظر آرہے تھے، میں نے حضرت جبریلؑ سے پوچھا، یہ کون لوگ ہیں؟ تو کہا: "یہ سود کھانے والے لوگ ہیں۔"

سود معاشرے میں جو فساد و بگاڑ پیدا کرتا ہے، مصیبت و بدحالی، تنگی و

غربت، اختلاف و انتشار کی جو فضا بنتا ہے اس کے سبب سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کا لفظ استعمال فرمایا جب کہ آپ کے اخلاقِ کریمانہ کے بارے میں کہا گیا کہ آپ کا اخلاق قرآنی تعلیمات کا آئینہ دار تھا (کان خلقہ القرآن) آپؐ نے فرمایا:

"سود کھانے والے، کِھلانے والے، اس کے لکھنے والے اور دونوں گواہوں (سب) پر خدا کی لعنت ہو۔ اور فرمایا: گناہ میں وہ سب برابر ہیں۔"

حدیث کا فقہی پہلو

شریعتِ اسلامی میں سود کی وہ شکل جو حرام ہے اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ اُدھار: یہ سود کی وہ قسم ہے کہ جس کو قرض دینے والا مقروض سے مدّتِ مقررہ تک اس کے پاس رقم رہنے کے عوض میں لے گا۔ سود کی یہ شکل قرآن و حدیث میں حرام قرار دی گئی ہے۔ سود کی یہی صورت بینکوں اور مالی لین دین میں رائج ہے۔

۲۔ بڑھا کر لینے کی صورت: جس کی حدیث میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ایک جنس کی چیز کو بڑھا کر لین دین کیا جائے، مثلاً ایک کلو گیہوں کو دو کلو گیہوں کے بدلے میں دیا جائے، اس صورت میں فقہی قاعدہ یہ ہے کہ جب دونوں جنسیں ایک ہوں تو اُدھار یا بڑھا کر دینا لینا حرام و ناجائز ہے اور دونوں جنسیں الگ الگ ہوں تو زیادتی تو جائز ہے اُدھار جائز نہیں۔ حدیث میں جو لعنت کی گئی ہے وہ دونوں ہی پر مشتمل ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ ربا ایک معاشرتی، سماجی اور دینی جرم ہے۔ جو نہایت خطرناک ہے اس لیے کہ وہ لوگوں میں عداوت و دشمنی کا سبب بنتا ہے اور باہم تعاون اور ہمدردی کی رُوح کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

۲۔ سود ان کبیرہ گناہوں میں ہے جن کا کرنے والا لعنت کا مستحق ہوتا ہے۔

۳۔ مسلمان کو چاہیے کہ ایسے اداروں میں کام کرنے سے پرہیز کریں۔ جو سودی کاروبار کرتے ہیں اس لیے کہ حدیث میں لعنت سودی کاروبار کے گواہ اور لکھنے والے پر بھی کی گئی ہے۔

۴۔ مسلمان کو حرام چیزوں سے بچنے میں شرعی حدود پر قائم رہنا چاہیے۔

———— ✤ ————

۲۲

کھانے پینے کے اسلامی آداب

عن ابن عمرؓ أن رسول اللہ صلعم قال: اذا أکل احدکم فلیأ کل بیمینه، واذا شَرِبَ فلیشربْ بیمینه، فإن الشیطٰن یاکل بشماله ویشرب بشماله۔ (مسلم)

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب تم کھانا کھاؤ تو داہنے ہاتھ سے کھاؤ اور جب کوئی چیز پیو تو داہنے ہاتھ سے پیو! شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے"

اسلام کا مقصد علی اُمتِ محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کو اچھے اخلاق اور پسندیدہ صفات کی تربیت دینا ہے، اس لیے کہ اسلام ایک خوب صورت خالص اور مثالی اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے، ایسا مثالی معاشرہ جس میں اسلامی صفات و عادات مسلمان کی پہچان بن گئی ہوں، چناں چہ دائیں کو خیر و برکت کا پہلو قرار دیا اور بائیں کو بُرائی اور بے برکتی کا پہلو گردانا، قرآن کریم نے متعدد آیات میں اس پہلو کی وضاحت کی ہے، فرمایا:

"فَأَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ مَا أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ" (واقعہ - ۸)

تو داہنے ہاتھ والے "سبحان اللہ" داہنے ہاتھ والے کیا ہی چین میں ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا:

"فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَهْ"

توجس کا (اعمال) نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ (دوسروں

سے) کہے گا کہ لیجیے میرا نامۂ اعمال، پڑھیے۔
ایک اور آیت میں فرمایا:
"فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا۔"
تو جس کا نامۂ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اس سے حساب آسان لیا جائے گا۔

داہنے پہلو میں خیر و برکت کے سبب عربی زبان کی اصطلاح میں یمن، خیر و برکت کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ اسلام نے اس کو باقی رکھا اور اس پر زور دیا، تاکہ امتِ مسلمہ دوسری قوموں سے ممتاز و نمایاں ہو، وہ ایک علامت و رمز بن جائے کہ اپنی عادات و طریقِ زندگی میں دوسری قوموں سے بالکل الگ ہو۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"إذا انتعل أحدكم فليبدأ باليمين وإذا نزع فليبدأ بالشمال فلتكن اليمنى أولهما تنتعل وآخرهما تنزع۔"
"جب تم جوتا پہنو تو دائیں پاؤں سے شروع کرو اور جب اتارو تو پہلے بائیں پاؤں کا جوتا اتارو۔ پہننے میں پہلے دایاں ہونا چاہیے، اتارنے میں بایاں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ آپ مسلمانوں کی مکمل تربیت فرمائیں، اخلاقی اعتبار سے بھی، معاشرتی اعتبار سے بھی، غرض یہ کہ ہر اعتبار سے اس کو اس طرح پروان چڑھائیں کہ اس میں وہ پاکیزہ اور اچھی عادتیں پیدا ہو جائیں جو محبت اور باہمی اتحاد و تعاون کے احساسات پیدا کرتی ہیں، اس لیے کہ عادات و اطوار میں یکسانیت اور ہر جگہ اور موقع پر اس کا باقی رکھنا مسلم معاشرے کے وجود کو قوت و طاقت پہنچاتا ہے۔

دایاں پہلو جب حضرت شارع علیہ السلام کے نزدیک عزت و قوت کا رمز قرار پایا تو اسلام نے اپنے فرزندوں کو کھانے پینے میں دائیں سے ابتدا کرنے کا حکم دیا بلکہ ہر حرکت و عمل میں دائیں سے ابتدا کرنے کا حکم دیا تاکہ وہ اخلاق و عادات ہر چیز میں نمایاں رہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اُمت کو انھیں اچھے اور نئے اسلامی طور و طریق پر تربیت کرنے کی فکر رہی، لہٰذا ہر موقع پر اس کی تعلیم فرماتے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں تشریف لائے، فرماتے ہیں: ہم لوگوں نے گھر میں پلی ہوئی بکری کا دودھ دوہا اور خدمت میں پیش کیا، آپؐ نے نوش فرمایا آپؐ کے بائیں طرف حضرت ابوبکرؓ تشریف فرما تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا، اللہ کے رسولؐ! آپ ابوبکر کو عنایت فرمائیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے داہنے بازو کی طرف بیٹھے ہوئے ایک اعرابی (دیہاتی عرب) کو دیا اور فرمایا، دائیں سے دائیں سے یعنی دائیں سے شروع کرنا اور ترتیب وار دیتے جانا چاہیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طرز عمل سے لوگوں کی اس طرح سے دائیں سے ابتدا کرنے کی تربیت فرمایا کرتے تھے، ایسے ہی بڑے کی عزت کا بھی حکم فرماتے، حضرت سہل ابن سعدؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشروب پیش کیا گیا، آپؐ نے نوش فرمایا، آپؐ کے داہنی جانب ایک لڑکا بیٹھا تھا اور بائیں جانب کچھ عمر دراز لوگ بیٹھے تھے، آپؐ نے لڑکے سے پوچھا "کیا تم اجازت دیتے ہو کہ ان بڑوں کو دوں" لڑکے نے کہا نہیں اللہ کے رسولؐ، خدا کی قسم آپؐ کے جھوٹے کی جو سعادت مجھے نصیب ہو رہی ہے اس پر میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا، حضرت سہلؓ فرماتے ہیں کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکے کے ہاتھ میں دے دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس انداز سے اپنی اُمت کی تربیت فرماتے تھے کہ اچھی عادات اور پسندیدہ خصلتیں اُمت کا شعار بن جائیں

چناں چہ ہر کام کو دائیں سے شروع کرنے، بڑوں کو چھوٹوں پر مقدم کرنے، چھوٹوں کی عزت و توقیر کرنے میں اُمتِ مسلمہ دوسری تمام قوموں سے ممتاز اور نمایاں ہے کیوں کہ وہ ایک ربانی قانون کی پابند ہے۔

مشرق سے لے کر مغرب تک کوئی اور ایسی قوم نہیں جس میں ان شریفانہ و پاکیزہ معاشرتی آداب کا خیال رکھا جاتا ہو، مسلمان جہاں کہیں بھی بستے ہیں دائیں ہاتھ سے کھانے پینے میں دوسری قوموں سے ممتاز و نمایاں نظر آتے ہیں، دائیں ہاتھ کا استعمال پورے عالم میں اُمتِ مسلمہ کے اتحاد کا رمز و علامت بن گیا ہے۔

البتہ بعض وہ اسلامی ممالک جو سامراجیوں کے چنگل میں تھے وہ ان اچھے اسلامی آداب و شعائر کو بھول گئے ہیں اور مغرب کی تقلید میں بائیں کا استعمال یا اتوار کے دن اداروں میں چھٹی کرنے لگے ہیں، اسی طرح کی اور دوسری چیزوں میں بھی مغرب کے پیرو بن گئے ہیں۔ آج کتنی شدید ضرورت ہے کہ ان اسلامی اقدار و آداب کو پھر سے زندہ کیا جائے اور اسلامی امتیازات و خصوصیات کو بحال کیا جائے۔

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ ایک روایت میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب تم کھانا کھاؤ تو دائیں ہاتھ سے کھاؤ، اور جب پیو تو دائیں ہاتھ سے پیو اس لیے کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا پیتا ہے۔ حضرت نافع اس روایت میں یہ اضافہ فرماتے تھے "بائیں ہاتھ سے نہ کوئی چیز لے نہ کوئی چیز دے۔

۲۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ دائیں ہاتھ سے کھانا پینا مستحب ہے اور بائیں ہاتھ سے کھانا پینا مکروہ ہے۔ حضرت نافع نے لینے اور دینے کا اضافہ کیا ہے۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کوئی عذر نہ ہو مثلاً بیماری یا زخم وغیرہ عذر کی صورت میں بائیں ہاتھ کا استعمال مکروہ نہ ہوگا۔

۳۔ ایسے افعال سے بچنا چاہیے جو شیطانوں کے افعال سے مشابہت رکھتے ہوں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ شیطانوں کے دو ہاتھ ہیں۔

۴۔ صاحب تحفۃ الاحوذی فرماتے ہیں:

(الف) اس حدیث سے دائیں ہاتھ سے کھانے پینے کا وجوب ثابت ہوتا ہے جیسا کہ امام شوکانیؒ نے فرمایا ہے، وجوب کی دلیل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "جب تم کھاؤ تو دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔" لاتے ہیں اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمر بن ابی سلمہ سے فرمانا کہ "دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔" کہتے ہیں کہ اس حکم سے اصلاً وجوب ثابت ہوتا ہے۔

(ب) حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے حافظ عراقی ترمذی شریف کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اکثر شافعی علماء نے اس حکم کو مستحب پر محمول کیا ہے، امام غزالیؒ اور امام نوویؒ بھی یہی رائے رکھتے ہیں لیکن امام شافعیؒ نے اپنی کتاب "الرسالہ" میں اور ایک اور جگہ کتاب الام میں اس حکم کو واجب قرار دیا ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ دائیں سے شروع کرنا مستحب ہے اس سے صفائی ستھرائی اور دائیں جانب کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

۲۔ دائیں کو بائیں پر فضیلت دی جائے گی۔

۳۔ اسلام کا منشا یہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ عام اور معمولی باتوں میں بھی دوسری قوموں سے ممتاز رہے، چناں چہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہو سلام سے پہچانا جاتا ہے خواہ وہ مشرق بعید میں ہو، اسی طرح دائیں سے ابتدا کرنے میں بھی وہ ہر جگہ ممتاز ہے۔

۲۳

اسلام میں حصولِ علم کی اہمیّت

عَنْ کثیر بن قیس، قال: کنت جالسا مع ابی الدرداء فی مسجد دمشق،
فجاءہ رجلٌ، فقال: یا ابا الدرداء، إنی جئتك من مدینة الرسول صلعم
لحدیث بلغنی عن رسول اللّٰہ صلعم، ما جئت لحاجة. قال: فانی سمعت
رسول اللّٰہ صلعم یقول: من سلك طریقاً یطلب فیہ علما سلك (اللّٰہ) بہ
طریقاً من طرق الجنة وإن الملائکة لتضع اجنحتها رضا لطالب العلم، وإن
العالم لیستغفر لہ من فی السّمٰوات ومن فی الارض والحیتان فی جوف الماء،
وإنّ فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلة البدر علی سائر الکواکب، وإن
العلماء ورثة الانبیاء، وإن الانبیاء لم یورثوا دیناراً ولا درهما، ورّثوا العلم
فمن اخذہ اخذ بحظ وافر۔" (رواہ ابوداؤد)

حضرت کثیر بن قیس سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں "میں دمشق کی مسجد میں حضرت ابو درداءؓ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اسی اثنا میں ایک آدمی ان کے پاس آیا اور عرض کیا: اے ابو درداءؓ! میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مدینہ منورہ سے ایک حدیث کے سلسلے میں آیا ہوں جس کے بارے میں معلوم ہوا کہ آپ اس حدیث کے راوی ہیں میرا اور کوئی مقصد نہیں۔ حضرت ابو درداءؓ نے فرمایا: "میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ جو شخص علم کی طلب میں کوئی راستہ طے کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے راستوں میں سے ایک راستے پر چلاتا ہے، فرشتے طالب علم کے لیے اپنے بازوؤں کو جھکاتے ہیں۔ طالب علم

کے اس عمل کی پسندیدگی کی وجہ سے عالم کے لیے زمین و آسمان کی تمام چیزیں دعائے مغفرت کرتی ہیں حتیٰ کہ مچھلیاں پانی کے اندر، عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چودھویں کے چاند کی فضیلت دیگر تمام ستاروں پر ہوتی ہے، علماء انبیائے کرام کے وارث ہیں۔ انبیائے کرام نے روپے پیسے کا وارث نہیں بنایا ہے، انھوں نے علم کا وارث بنایا ہے۔ جس نے اس کو حاصل کرلیا (ذخیرکا) بہت بڑا حصّہ حاصل کرلیا۔"

کتاب وسنّت کے علم پر زور دینے کا مسلمانوں کی عملی زندگی کو ترقی دینے اور اس کو عروج پر پہنچانے میں بڑا دخل اور اثر رہا ہے۔ اسلام کے نظریۂ حیات میں عالم و جاہل برابر نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ" (زمر - ۹)

کہو بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم کو غیر اہلِ علم سے بلند مرتبہ عطا فرمایا ہے اور دوسروں پر ان کو مقدم رکھا ہے، فرمایا:

"يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ" (المجادلہ - ۱۱)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے خدا ان کے درجے بلند کرے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی قوم میں جو اس زور و تاکید کے بغیر علم کی طرف نہیں متوجہ ہو سکتی تھی۔ قلم کی قسم فرما کر علم پر زور دیا۔ کتابت و تحریر میں یہ قوم بہت پیچھے تھی اس میں کتابت نایاب و نادر تھی۔ چند لوگ ڈھونڈے سے ملتے جو پڑھنا لکھنا جانتے ہوں، وہ قوم جس کے لیے یہ مقدر ہو چکا تھا کہ:

"كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ" (آل عمران - ۱۱۰)

مومنو! جتنی اُمتیں یعنی قومیں لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو۔

اِس قوم کے لیے لازم و ضروری تھا کہ علم میں ترقی کرے اس لیے کہ نیکی کا حکم دینے اور بُرائی سے روکنے کی ذمہ داری اس کی متقاضی تھی کہ یہ قوم علم کی طرف متوجہ ہو، اور اس کو حصول علم پر ابھارا اور آمادہ کیا جائے تاکہ وہ اسلامی عقیدہ اور اس کے دستور حیات کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کی ذمے داری سے عہدہ برآ ہو سکے، اسلام کے علم پر زور دینے کی مزید تاکید اس سے معلوم ہوتی ہے کہ پہلی وحی کی ابتدا علم و قلم ہی کے ذکر سے ہوتی ہے، فرمایا:

"اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔" (علق - ۱-۵)

(اے محمدؐ) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے (عالم کو) پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا، پڑھو، اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

یہ خطاب اس نبیٔ اُمّی سے ہو رہا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ نے یہی مقدر فرمایا تھا کہ وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو (تاکہ آپ جو کچھ فرمائیں اور وحی کی باتیں سُنائیں، لوگ یہ نہ کہیں کہ کسی سے پڑھ کر آئے ہیں ایک بڑی حکمت تو یہی معلوم ہوتی ہے) اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم اور علماء کی طرف غیر معمولی توجہ فرمائی، چناں چہ علم اور مطالعے کا شوق دلانے اور اس پر آمادہ کرنے والی، علم اور علماء کے مقام بلند کو بتانے والی احادیث سے کتب احادیث بھری پڑی ہیں، یہ مختلف النوع اور بے شمار احادیث اس اُمّت کی خدائی انداز سے تربیت اور مذکورہ زبردست تکوینی ذمے داری کو سنبھالنے

کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ حضرت ابو درداءؓ کی یہ حدیث ان احادیث میں سب سے بہتر حدیث ہے جو اس ذمّے داری کو واضح کرتی ہیں۔ اس حدیث کا سب سے پہلا لفظ "سلك" ہے جس کے لغوی معنی یہ ہیں کہ آدمی جس راستے پر چل پڑا ہے اسی پر چلتا جائے اس لیے کہ علم ایسا سمندر ہے جس کا ساحل نہیں، لہٰذا علم کے راستے پر برابر چلتے رہنا چاہیے تاکہ طالب علم کو علم کا کوئی قطرہ نصیب ہو جائے۔

حضرت امام شافعیؒ کا مقولہ ہے "علم تمہیں اپنا تھوڑا سا بھی حصّہ اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک کہ تم اس کو اپنا سب کچھ نہ دے دو۔"

اس کے بعد حدیث میں "یبتغی" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں طلب علم میں مخلص و شائق ہونا، اس لفظ سے پہلے لفظ کی تاکید و وضاحت ہوتی ہے، اس کے بعد وہ لفظ آتا ہے جو اپنے اندر بہت سے معانی سموئے ہوئے ہے "علماً" نکرہ کا صیغہ ہے جو علم کی ہر قسم پر مشتمل ہے۔ سب سے اوّل تو وہ ایمان کے پانچوں ارکان اور اسلامی اصول و ضابطے اور شریعت میں حرام کی ہوئی پانچ بنیادی چیزیں۔ جو ذیل کی آیت میں اس طرح کھول کر بیان کر دی گئی ہیں:

"قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (اعراف۔ ۳۳)

کہہ دو کہ میرے پروردگار نے تو بے حیائی کی باتوں کو ظاہر یا پوشیدہ اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کرنے کو حرام کیا ہے اور اس کو بھی کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی سند نہیں نازل کی۔ اور اس کو بھی کہ خدا کے بارے میں ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں کوئی علم نہیں۔

معاشرت و معاملات کے احکام، تجرباتی اور جدید قانونی علوم کا پڑھنا اور سیکھنا بھی ان علوم میں سے ہے جن کے سیکھنے کا شریعت اسلامی نے حکم دیا ہے اور اس طرف

رہ نمائی کی ہے، اس لیے کہ یہ علوم تمدن و ترقی اور زندگی کے دیگر میدانوں میں آگے بڑھنے کا ذریعہ ہیں خصوصاً فوجی طاقت موجودہ زمانے میں جنگ کا سارا انحصار علم ہی پر ہے، ذیل کی آیت قرآنی میں اسی طرف اشارہ ہے، فرمایا:

"وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ" (انفال - ۶۰)

اور جہاں تک ہو سکے (فوج کی جمعیت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلہ کے) لیے مستعد رہو کہ اس سے خدا کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر ہیبت بیٹھی رہے گی۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ ان جدید سائنسی اور تجرباتی علوم کا حصول مغربی تہذیب و طرز فکر پر نہ ہو، بلکہ ضروری ہے کہ ہمارا علم جدید کا ماہر اپنے اندر ایسا کمال پیدا کرے کہ ان علوم کو مغربی اُصولوں سے آزاد کرکے ہمارے اسلامی اصولوں سے جوڑ دے، فکر و عقیدے کے اعتبار سے بھی اور ثقافت و تمدن کے اعتبار سے بھی۔

علم کی ترغیب و تشویق میں مختلف انداز سے کثرت سے احادیث ہیں مثلاً علماء کے لیے ملائکہ کا دعا کرنا، مچھلیوں کا پانی میں دعا کرنا، زمین و آسمان کی تمام چیزوں کا عالم کے لیے دعا کرنا وغیرہ ایسی تشبیہات اور مثالوں کے ذریعے جن سے بات پوری طرح واضح ہو جائے اور علم کی قدر و قیمت عیاں ہو کر سامنے آجائے اور علماء کا مقام و مرتبہ بلند ہو۔

حدیث کا آخری لفظ علم اور علماء کی بلندی کے بارے میں آخری درجے کا ہے کہ علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صحابۂ کرام کے لیے حصول علم کا محرک بنا چناں چہ وہ حصولِ علم کے ایسے رسیا بنے کہ حضرت ابن عباسؓ کا تو یہ عالم تھا کہ اگر ان کو معلوم ہوتا کہ فلاں صاحب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث معلوم ہے تو وہ ان کے دروازے

پر حاضر ہوتے۔ اگر وہ قیلولہ فرما رہے ہوتے تو ابن عباسؓ اپنی چادر سر کے نیچے رکھ کر ان کے دروازے پر بیٹھ جاتے، گرد و غبار ان کے اُوپر پڑتا رہتا اور کوئی پروا نہ کرتے۔ فرماتے ہیں کہ وہ بزرگ نکلتے اور مجھ کو دیکھ کر فرماتے، حضور کے چچا کے فرزند کیسے تشریف لانا ہوا؟ آپ نے مجھے بلا کیوں نہ بھیجا، میں حاضرِ خدمت ہو جاتا، ابن عباسؓ جواب میں فرماتے نہیں میرا یہ فرض تھا کہ حاضرِ خدمت ہوتا، پھر ان سے حدیث پوچھتے۔

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ حدیث حصولِ علم پر آمادہ کرتی ہے جو قرآن حدیث یا ضروری فریضۂ زندگی ہیں، یہ علوم حسبِ ذیل ہیں:

(الف) جن علوم کا حاصل کرنا فرض ہے وہ دینی اور شرعی علوم ہیں۔

(ب) وہ علوم جن کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ وہ علوم جدیدہ جو مفید و نفع بخش ہوں، بعض لوگوں کے نزدیک اِن کا حصول واجب ہے، اس لیے کہ وہ اس اصول میں داخل ہیں کہ جس کے بغیر واجب کی ادائی نہ پوری ہو سکتی ہو، اس کا حصول بھی واجب ہے۔

۲۔ حصول علم واجب ہے گو اس سلسلے میں صحیح حدیث نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اتنے علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے لازم ہے جتنے کا وہ وضو، نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل جاننے کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ اس حدیث کو یہ دوسری حدیث تقویت پہنچاتی ہے (طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم) ہر مسلمان مرد و عورت پر علم کا حاصل کرنا فرض ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ اس حدیث کا مسلمانوں سے مطالبہ ہے کہ کسی چیز کو معلوم کرنے کے لیے وہ یقینی علم پر اعتماد کریں، خیالی اور ظنی علم پر نہیں۔ اسی لیے حصول علم کی ہمت افزائی اور اس پر

آمادہ کرنے کے لیے ان تمام طریقوں کو استعمال کیا گیا ہے جن سے وضاحت ہوتی ہے۔
مثلاً قرآن کریم نے اس طرح ترغیب دی ہے (اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ)
اللہ تعالیٰ سے اس کے عالم بندے ہی ڈرتے ہیں۔

۲۔ ہر وہ علم جو عمل کا نفع نہ دے شریعت میں اس کی تحسین نہیں کی گئی ہے۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد (علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں) اس بات کو واضح
کر دیتا ہے کہ علم عمل کا محرک ذریعہ ہے اور اصلاً عمل ہی مقصود ہے۔

۳۔ یہ حدیث پاک علماء کا مرتبہ بلند کرتی ہے تاکہ علم کے طلب گار علماء کی
خدمت میں حاضر ہوں اور ان کے علم سے فیض یاب ہوں، حکام و ذمہ داران حکومت
بھی علماء کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تاکہ مسئلہ و مسائل معلوم کریں، ان کے علم
سے مستفید ہوں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے کتاب و حکمت سکھانے والے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کو مبعوث فرما کر ہم پر لطف و کرم فرمایا، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

"قَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا
مِنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ
الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ" (آل عمران۔ ۱۶۴)

خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے، ان میں انھیں میں سے ایک پیغمبر بھیجے
جو ان کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور ان کو پاک کرتے اور
(خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔

اس آیت پاک سے عالم اور طالب علم کی فضیلت کھل کر سامنے آجاتی ہے
اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم حاصل کرنا زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے
کہ اس کے بغیر انسان کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ دنیا کے جھمیلوں میں کس طرح زندگی گزارے۔

۲۴

اچھّوں اور بُروں کی صحبت کے اثرات

عن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللّٰہ عنہ، قال: قال رسول اللّٰہ صلعم:
مثل الجلیس الصالح والجلیس السوء کحامل المسك ونافخ الکیر،
فحامل المسك إما أن یحذیك وإما أن تبتاع منه وإما
ان تجد منه ریحاً طیبة، ونافخ الکیر إما أن یحرق ثیابك
وإما أن تجد ریحاً خبیثة" (متفق علیہ)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللّٰہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"نیک اور بُرے ساتھی یا دوست کی مثال، مُشک فروش اور بھٹی
دھونکنے والے کی طرح ہے کہ مُشک فروش تم کو کچھ فائدہ ہی پہنچائے گا،
یا تم اس سے خوشبو خریدوگے اور نہیں تو اس کے پاس بیٹھنے ہی سے
تم کو خوشبو ملے گی اور بھٹی دھونکنے والا یا تو تمہارے کپڑے جلادے گا
یا ناپسندیدہ بو ملے گی۔"

یہ حدیث بندۂ مومن کی تربیت و اصلاح کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جو اسلامی معاشرے کے خوش نما محل کی ایک اچھی اینٹ کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اپنے ہر اُمّتی کے قلب وضمیر دونوں کو پاک وصاف کرنے کے لیے ہمہ وقت فکرمند رہا کرتے تھے۔ اور تربیت وصفائیٔ قلب کا یہ کام ان واقعات و حوادث کی مناسبت سے فرمایا کرتے تھے جو وقتاً فوقتاً بدلتے اور نئے انداز سے پیش آتے رہتے تھے۔ مدینہ

منورہ کا سماج و معاشرہ مسلم اکثریت پر اور منافقین نیز اہل کتاب اور مشرکین پر مشتمل تھا جو بہت کم تعداد میں تھے لیکن معاشرتی اور سماجی تقاضوں کی بنیاد پر مسلمانوں کو ان لوگوں سے ملنے نہیں دیتے۔ لیکن جب معاملات کرنے کے لیے ملنا جلنا پڑتا تو وہ ان لوگوں سے متاثر ہوتے تھے اس لیے کہ جب بھی موقع ملتا یہ غیر مسلم اقلیتیں ان کے ذہنوں میں الجھن اور خلش پیدا کرنے سے نہیں چوکتیں۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ایسے معیار اور پیمانے مقرر فرما دیے جن کی روشنی میں مسلمان ان تمام فتنوں سے محفوظ و مامون رہیں، چناں چہ آپ نے ارشاد فرمایا:

"آدمی اپنے دوست و رفیق کے دین کا اثر قبول کرتا ہے لہذا دوستی کرتے وقت سوچ سمجھ لے کہ کس سے دوستی کر رہا ہے، اچھے آدمی سے یا بُرے سے۔"

اسی لیے آپ نے مسلمانوں کو ترغیب دی کہ آپس میں ایک دوسرے سے ملتے رہا کریں، باہم ربط و تعلق پیدا کریں اور اس طرح اپنے ایمان کو تازہ کرتے رہا کریں۔ اسی کا اثر تھا کہ ایک صحابی دُوسرے صحابی کو کہتے ہیں:

"آؤ آؤ تھوڑی دیر ایمان کی باتیں کریں۔"

یعنی ایمان تازہ کرنے والی چیزوں کا ذکر کریں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ سابقہ زندگی کے اثرات، طبعی رجحانات کی کشش، انسانی کمزوری، معاشرتی عرف و عادت کے تقاضے کبھی کبھی بعض مسلمانوں کو غیر مسلم جماعتوں کی طرف لے جاتے ہیں اور وہ ان سے میل جول اور محبت کا معاملہ کرنے لگتے ہیں۔ جو مُضر ہوتا ہے، ان لوگوں کے اثرات پڑتے ہیں، لہذا آپ نے اس کے لیے معیار اور پیمانہ مقرر فرما دیا، فرمایا:

"صحبت مسلمان ہی کی اختیار کرو، اور تمہارا کھانا پرہیزگار لوگ ہی کھایا کریں۔" (ابو داؤد و ترمذی)

یعنی دوستی اور خلا ملا کا جہاں تک تعلق ہے کہ آپس میں بے تکلف ملو اور ایک ساتھ اُٹھو بیٹھو، کھاؤ پیو تو یہ بات مسلمان ہی کے لیے ہونی چاہیے، دوسروں کے ساتھ بس واجبی ربط و تعلق ہونا چاہیے جو سماج و معاشرہ کی ایک ناگزیر شے ہے، زیادہ خلط ملط اور ایسی بے تکلفی جس میں ان کے اثرات پڑیں، مناسب نہیں۔

اِس نزاکت کے پیشِ نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلے میں برابر چوکس و بیدار رہتے تھے اور اس کو مختلف انداز سے دہراتے رہتے تھے تاکہ نئی تربیت کی راہ میں رکاوٹ بننے والی پُرانی چیزیں نہ غالب آنے پائیں چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ "اللہ کے رسولؐ! ایک شخص ایسے لوگوں سے محبت کرتا ہے جن سے ملاقات نہیں ہوتی" تو آپؐ نے فرمایا "آدمی جس طرح کے لوگوں سے محبت کرتا ہے، اس کا شمار اسی طرح کے لوگوں میں ہوگا۔" (ابوداؤد)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی حدیثِ بالا تربیت کے اچھّے انداز کا نمونہ پیش کرتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ دوست و ہم نشیں دو طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلا وہ جو ایک نیک اور شریف بھائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ تمہیں ایسی باتیں بتاتا ہے جو دین و دنیا دونوں اعتبار سے تمہارے لیے فائدہ مند ہوں۔ وہ دوست اپنے قول و عمل سے تم کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اخلاق کریمہ پہ آمادہ کرتا ہے، مسلمان کو ایسے ہی دوستوں سے دوستی کرنے کا شوقین و خواہش مند رہنا چاہیے — دوستوں کی دوسری قسم بُرے لوگوں کی ہے، ان سے جو بھی دوستی کرے گا اور ملے جلے گا، یہ ان کے لیے بدترین دوست ثابت ہوں گے، اس لیے کہ دوست نفس امارہ کا معین بن جاتا ہے۔ جو برائی ہی کی طرف کھینچتا رہتا ہے، چناں چہ ایسا دوست اپنے دوست کو ہلاکت و بربادی میں ڈال دیتا ہے اور اللہ کے غیظ و غضب کا مستحق بنا دیتا ہے۔ اس لیے مسلمان کو حکم ہے کہ وہ اچھے دوست و احباب کا انتخاب کرے جیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہو رہا ہے اور بُرے دوستوں سے بہت

دُور رہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے بُرے دوست کی حقیقت، نفع اور نقصان واضح کر دینے کے لیے ایسی تشبیہ دی جو حقیقت کو عقل و دل میں اُتار دے، آپؐ نے اچھے اور نیک دوست کی مثال مشک فروش سے دی، اور بُرے دوست کی مثال بھٹی جلانے والے سے دی، یہ دونوں مثالیں ایسی ہیں کہ ان کا اثر ہر صاحبِ عقل و نظر بہ آسانی محسوس کرے گا۔ عطر فروش اپنے گرد و پیش کی فضا کو معطر کر دیتا ہے، فضا کو خوشبو سے بھر دیتا ہے، اس سے مست کر دینے والی پاکیزہ خوشبو نکلتی ہے، راستہ چلتا آدمی بھی اس خوشبو سے لطف اندوز ہوتا ہے، تو جو بیٹھا ہو، اس کے قریب ہو، اس کو کتنا فائدہ پہنچے گا، وہ کیسا مست و سرشار ہوگا۔

اس کے برعکس بھٹّی دھونکنے والا فضا کو غبار آلود کر دیتا ہے، دھواں اور سیاہی سے اس کو بھر دیتا ہے۔ اس کے اردگرد کے لوگوں کا دَم گھٹتا ہے اور وہ اس کی گرمی سے تپتے ہیں۔

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ ایسے شخص کے پاس بیٹھنا منع ہے جس کے پاس بیٹھنے سے نقصان ہوتا ہو، مثلاً غیبت کرنے والے یا دیگر غلط و نقصان دہ باتیں کرنے والے شخص کے پاس بیٹھنا اس کے برعکس جس شخص کے پاس بیٹھنے سے نیکی اور بھلائی حاصل ہوتی ہو، اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ ہو، آخرت کی فکر پیدا ہو، علم میں اضافہ ہو، اچھے کاموں کا علم ہو تو اس کے پاس بیٹھنا مستحب اور بہتر ہے۔

۲۔ حدیث سے دینی مسائل میں قیاس سے کام لینے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

۳۔ حدیث سے مثالیں بیان کر کے بات کی وضاحت کرنے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

۴۔ مُشک کے پاک ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ انسان اپنے ہم نشینوں اور دوستوں کے اخلاق اور کردار سے متاثر ہوتا ہے، یہ لوگ بُرے ہوں تو بُرا اثر پڑتا ہے، اچھے ہوں تو اچھا اثر پڑتا ہے۔

۲۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بدکردار لوگوں سے دوستی نہیں رکھنی چاہیے نہ ان سے محبت اور میل ملاپ رکھنا چاہیے۔

۳۔ حدیث میں اچھے اور نیک دوستوں کے انتخاب کا شوق دلایا گیا ہے۔ جو انسان کی زندگی سنوارنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

۲۵

والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کے طریقے

عن ابی اسید مالك بن ربیعة الساعدی رضی اللہ عنه، قال بینما نحن عند رسول اللہ صلعم اذ جاءہ رجل من بنی سلمة فقال: یارسول اللہ، هل بَقِیَ من برّ ابویّ شی ابرُّهما به بعد موتهما؟ فقال "نعم الصلاۃ علیهما، والاستغفار لهما وانفاذ عهدهما، وصلة الرحم التی لا توصل الا بهما، واکرام صدیقهما۔ (رواہ ابوداؤد)

ابو اسید مالک بن ربیعہ ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے اسی اثناء میں بنو سلمہ کا ایک شخص آیا، اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے والدین انتقال فرما چکے ہیں، کیا ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی کوئی شکل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "ہاں! ان کے لیے دعائیں کرنا، استغفار کرنا، ان کے عہد کو جس کے پورا کرنے سے پہلے وہ دنیا سے رُخصت ہو گئے، اس کا پُورا کرنا اس رشتے کو جوڑنا جو والدین ہی کے تعلق سے جوڑا جاتا ہے، ان کے دوستوں کا اکرام و احترام کرنا۔"

دین اسلام میں والدین اور رشتے داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک اور تعلقات کا

جوڑے رکھنا، اسلامی عقیدے کی بنیادی خصوصیت و پہچان ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "رشتوں کا توڑنے والا جنّت میں داخل نہیں ہوگا۔" عربی کا لفظ "برّ" نیکی اور بھلائی کی ہر صورت پر حاوی اور شامل ہے۔ دوسرے مذاہب و ادیان میں والدین کے بارے میں اس طرح کی تعلیمات کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا۔ قرآن کریم میں متعدد جگہ والدین کا ذکر آیا ہے۔ اور اکثر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد فوراً والدین کے حقوق کا ذکر آیا ہے۔ ارشادِ پاک ہے:

"اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا۔"

(النساء - ۳۶)

اور خدا ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔

اللہ تعالیٰ کے احکامات کا تعلق زیادہ تر والدین اور پھر رشتے داروں سے ہے پھر ان کا دائرہ پھیل کر دوسرے اہل حقوق اور ضرورت مندوں تک پہنچتا ہے۔ احکامات کی ترتیب کا یہ اسلوب و طریقہ عین فطرت بشری کے مطابق ہے کہ اس کی ابتداء پہلے والدین اور اپنے گھر سے ہوتی ہے اس کے بعد جماعت و معاشرے کے دائرے میں پھیلتی ہے تاکہ چھوٹی چھوٹی وحدتوں اور مقامی مجموعوں کے تیار کرنے کا کام آسان ہو سکے یہ انداز مناسب وقت اور سہولت کے ساتھ مقصود کو پورا کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک کے ذکر کا اللہ کی عبادت کے ذکر کے معاً بعد آنا اس بات کا اعلان و ثبوت ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا درجہ ہے۔

ملاحظہ فرمائیں کہ مذکورہ آیت میں بھی اور ذیل کی آیت میں بھی، اللہ تعالیٰ کی عبادت کے حکم کے بعد فوراً والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا۔ (النساء۔۲۳)
اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو)۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کی مختلف شکلوں کی وضاحت سے احادیث شریفہ بھری ہوئی ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین سے قطع تعلق کو کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ شمار فرمایا ہے۔ آیات قرآنی نے جس طرح سے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ فوراً ذکر کیا ہے۔ اسی طرح سے گناہِ کبیرہ کو بیان کرنے والی احادیث نے والدین سے قطع تعلق کا ذکر شرک کے فوراً بعد کیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کیا میں تم کو کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے گناہ سے باخبر کروں؟" (تین بار آپؐ نے یہ فرمایا)۔ ہم لوگوں نے کہا: "کیوں نہیں اللہ کے رسولؐ ضرور ارشاد فرمائیں"، آپؐ نے فرمایا: "خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا اور والدین سے قطع تعلق کرنا۔" الخ

احساسات کو ابھارنے اور دل وضمیر کو مخاطب کرنے والی ان عبارتوں کے ذریعے اسلام نے مسلمانوں کے دلوں کو نیکی اور رحمت کے جذبات سے بھر دیا ہے، لہٰذا صحابۂ کرام کثرت سے والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے، جن کے والدین زندہ تھے وہ بھی اور جن کے والدین کا انتقال ہوچکا تھا وہ بھی۔

حافظ ابو بکر بزارؒ اپنی حضرت بریدہ والی حدیث کی سند سے، جو انھوں نے اپنے والد کے حوالے سے بیان کی ہے، بیان کرتے ہیں، "ایک شخص اپنے والدہ کو اٹھائے ہوئے طواف کررہا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا، "کیا تم نے اپنی والدہ کا حق ادا کردیا؟" اس نے کہا، "نہیں"، دوبارہ آہ سرد بھر کر کہا، "نہیں۔"

اس طرح کے واقعات اور سوالوں سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ صحابۂ کرام کے دلوں میں والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کی کیا قدر و قیمت تھی، احادیث شریفہ کا آیاتِ قرآنی سے مربوط ہونا اور اس کی وضاحت ہی حقیقت کا اعلان تھا کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا کیا درجہ اور مرتبہ ہے۔

والدین کے حسنِ سلوک کی اسی اہمیت و تاکید کے سبب صحابۂ کرام حسنِ سلوک کے طریقوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کرتے رہتے تھے، ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور سوال کرتا ہے کہ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے والدین کا انتقال ہو چکا ہے، کیا اس کے بعد بھی ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کی کوئی صورت ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب میں فرماتے ہیں: "ہاں ان کے لیے دعا کیا کرو"۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (رَبَّنَا اغْفِرْ لِی وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ) اے پروردگار مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور مومنوں کو معاف کردے۔

قرآن کریم کے یہ پُرمغز دعائیہ الفاظ مسلمان نماز کے اندر اور باہر بھی برابر پڑھتا اور دہراتا رہتا ہے۔ دعا کا مطلب یہ کہ ان کے لیے برابر استغفار کرتا رہے، ان کی مغفرت اور بلندیٔ درجات کا بارگاہِ ایزدی میں برابر طلب گار رہے۔ دعا کے ساتھ ساتھ اگر والدین کے ذمّے کوئی حق اور عہد یا قرض وغیرہ باقی ہو تو اس کے ادا کرنے کی کوشش کرے، ان حقوق العباد کے علاوہ حقوق اللہ میں سے اگر کوئی حق ان پر باقی ہے تو اس کو بھی ادا کرے مثلاً حج یا روزے وغیرہ ان کے ذمّے باقی ہیں تو ان کو بھی ادا کرے۔ ان حقوق کی ادائی والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی بہترین شکل ہے۔

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ علماء کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ مذکورہ حدیث سے یہ بات بہت

واضح ہے کہ اولاد کے صدقے، حج اور نماز وغیرہ کا ثواب والدین کو پہنچتا رہتا ہے۔ پھر اس کی روشنی میں انھوں نے فرمایا کہ اولاد اور غیر اولاد میں فرق نہیں، جو مسلمان بھی ثواب پہنچائے گا ان کو پہنچے گا، اسی سے علماء اس بات کے قائل ہوئے کہ مرنے کے بعد جب کسی مومن کو ایصال ثواب کیا جائے گا تو وہ اس کو پہنچے گا۔

۲۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میت پر صدقہ کرنے کا حکم فرمایا ہے اسی طرح سے اس کی طرف سے روزہ رکھنے کا بھی حکم فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ مُردوں کی طرف سے صدقہ کرنا اعمال صالحہ میں شامل ہے، اسی طرح ان کی طرف سے روزہ بھی نیکیوں میں شامل ہے، اسی سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ مُردوں کو مالی عبادت مثلاً صدقے کا ایصالِ ثواب جائز ہے، اسی طرح بدنی عبادت مثلاً تلاوت نماز اور روزے کا ثواب مُردوں کو پہنچانا جائز ہے۔ اور یہ پہنچتا ہے۔ حضرت امام احمدؒ، امام ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک ہے، مالکی اور شافعی علماء کی ایک جماعت کا بھی یہی مسلک ہے لیکن مالکی اور شافعی علماء کی اکثریت کی رائے ہے کہ بدنی عبادت کا ثواب نہیں پہنچتا۔ اس اختلاف کے باوجود سلف کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب نفلی نماز پڑھتے یا روزہ رکھتے یا حج کرتے تو اس کا ثواب عام مسلمان مُردوں کو پہنچاتے۔ اس میں کسی کی تخصیص نہیں کرتے، بلکہ یہ ان کا معمول تھا۔ لہٰذا سلف کے اس طریقے سے ہٹنا نہیں چاہیے کہ یہ بہتر اور اچھا عمل ہے۔

سوال کیا گیا کہ میّت کے متعلقین تلاوت کریں، تسبیحات، تکبیرات اور کلمۂ لا الٰہ پڑھ کر ایصالِ ثواب کریں تو ثواب پہنچتا ہے کہ نہیں؟ جواب میں فرمایا: میّت کے اعزاء اگر تلاوت و تسبیح، تکبیر اور تہلیل (لا الٰہ الا اللہ کہنا) اور دیگر الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں اور اس کا ثواب مُردوں کو پہنچائیں تو پہنچتا ہے۔ (واللہ اعلم)

(مجموعہ فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ)

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ حدیث سے رہ نمائی ملتی ہے کہ مسلمان کو چاہیے کہ عبادت اور ثواب کے کاموں

میں نیز خطاؤں کو مٹانے کے سلسلے میں حدیث پاک میں مذکور حدود کا خیال رکھے کیوں کہ انسان کی نیکیوں سے اس کی بُرائیوں کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں اور اس کے احتیاط و تقویٰ کے سبب اس کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

۲۔ اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کے سلسلے میں اس کی مختلف صورتوں اور طریقوں کو معلوم کرنے کے لیے کتنے فکرمند اور حریص رہا کرتے تھے۔

۳۔ حدیث میں یہ وارد ہے کہ انسان کی اولاد اسی کی کوشش و عمل کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ والدین کو اولاد کے عمل کا فائدہ پہنچتا ہے۔ اولاد ایصالِ ثواب کرتی ہے تو وہ والدین کو پہنچتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جنت میں آدمی کا مرتبہ بلند کیا جائے گا تو وہ سوال کرے گا، یہ کیسے؟ (ہم نے تو اس درجے کا عمل کیا نہیں) تو جواب دیا جائے گا کہ تمہارے لڑکے نے تمہارے لیے دُعا و استغفار کیا ہے اس کے سبب یہ مرتبہ ہے۔

۲۶

مسلمانوں کے اخلاق

عن أبی ذر قال: قال لی رسول اللہ صلعم "اتق اللہ حیثما کنت و اتبع السیئۃ الحسنۃ تمحہا، وخالق الناس بخلق حسن" ۔ (رواہ الترمذی)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا کہ: مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیحت کی کہ: "جہاں کہیں بھی رہو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اس کا پاس و لحاظ رکھو، اور کوئی گناہ و خطا سرزد ہو جائے تو اس کی تلافی کے لیے نیک عمل کرو۔ نیکی بُرائی کو مٹا دیتی ہے اور لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق کا برتاؤ کرو۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کی راہ میں پیش آنے والی مشقتوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے جو کانٹوں سے پُر اور مشکلات و دشواریوں سے بھری ہوئی ہے، قدم قدم پر خواہشاتِ نفسانی اور راہ سے بہکا دینے والی چیزوں کا جال بچھا ہوا ہے، تعلیم و تربیت کے مختلف اسلوب و طریقے اختیار فرمائے، تاکہ ایک مسلمان کی شخصیت کی تعمیر اس پسندیدہ طریقے پر ہو جو خدا کے عبادت گزار اور اس کا پاس و لحاظ کرنے والے بندوں کا ہوتا ہے، جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے حق کو ادا کیا اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جو حاضر و موجود، نظروں سے غائب اور اوجھل چیزوں کا رب ہے اور سارے انسانوں کا وہی پیدا کرنے والا ہے۔

لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بندۂ مومن کو نصیحت فرمائی کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو تمام احکاماتِ خداوندی کو بجا کر اور اس کی منع کی ہوئی تمام باتوں سے باز رہ کر اس کا ادب ملحوظ رکھے اور خوفِ خدا کو زندگی کا دستور بنالے۔ ایسا دستور جو دل میں بیٹھ گیا ہو اور اس کا احساس و شعور پوری زندگی میں سما گیا ہو، ایسا پختہ نظامِ زندگی جو حرام و حلال

کا فرق بتاتا ہو۔ وہ لوگوں کے ساتھ سلوک و معاملات کرنے میں بھی جاری ہو اور اچھے اخلاق، دل خوش کردینے والی مُسکراہٹ میں بھی اس کا جلوہ نظر آتا ہو اور مخلصانہ بھائی چارے میں بھی اسی کا اثر جھلکتا ہو۔ تنہائی اور خلوت، کھلے اور چھپے، خوش حالی اور فقر و پریشانی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حفاظت و نگرانی کا احساس کامل پایا جاتا ہے۔ صاحب تحفۃ الاحوذی کے مطابق (بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے پوشیدہ کام کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح تمہارے کھلے اور عام ہونے والے کاموں کو جانتا ہے۔ لہذا تم اللہ تعالیٰ کے حکموں اور اس کی رضا والے کاموں کو بجالانے، نیز اس کو ناراض کرنے والے اور بُرے کاموں سے بچنے میں ادب اور تقویٰ کی حد کا پورا پورا خیال رکھو اس لیے تقویٰ ہی دین کی اساس ہے اور اسی کے ذریعے یقین کامل کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے)۔ (تحفۃ الاحوذی)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"واتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام ان اللہ کان علیکم رقیبا۔ (النساء - ۱)

اور خدا سے جس کے نام کو تم اپنی حاجت برآری کا ذریعہ بناتے ہو ڈرو اور (قطع) ارحام سے (بچو) کچھ شک نہیں کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔"

تقویٰ کے مقام پر اس طرح سے قائم رہنا بڑا مشکل اور دشوار کام ہے اس کے لیے ایسے توشۂ راہ کی ضرورت ہے جو تقویٰ پر قائم رہنے میں مددگار ثابت ہو، استقامت و ثبات کی غذا بہم پہنچائے۔ تقویٰ کی اس راہ پر قائم رہنے میں مددگار و معاون صورت کو اللہ تعالیٰ اچھی طرح بتا دیتا ہے اور دل و ضمیر جب دنیا کے جھمیلوں اور اس دنیا کی بہکانے والی خوش نما چیزوں سے پراگندہ ہو جائیں تو ان کو پاک صاف کرنے کا طریقہ کھول کر بیان فرما دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

واقم الصلوٰۃ طرفی النھار وزلفا من اللیل ان الحسنات یذھبن السیئات۔ (ہود - ۱۱۴)

"اور دن کے دونوں سروں (یعنی صبح اور شام کے اوقات میں) اور رات کی چند (پہلی) ساعات میں نماز پڑھا کرو، کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دُور کر دیتی ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ یہی وہ زادِ راہ ہے جو اس وقت کام آئے گا جب دنیا کی ہر چیز فنا ہو جائے گی، اقامتِ صلوٰۃ کا مطلب نماز کو اس کے پورے ارکان کی تعدیل کے ساتھ ادا کرنا ہے یہ اس لیے کہ نماز نیکی یعنی حسنہ کی کامل ترین صورت ہے، اسی لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خطا اور بُرائی کے بعد نیک عمل کرو، نیک عمل بُرائی کے اثر کو ختم کر دے گا، اس لیے کہ نیکی بُرائی کو مٹاتی اور ختم کرتی ہے اور نیکی کے ذریعے اللہ تعالیٰ دل پر پڑنے والے بُرائی کے اثر کو مٹا دیتا ہے، اس لیے کہ بیماری کا علاج اس کی مخالف چیزوں سے ہوتا ہے، لہٰذا بُرائی کے مرض کے اثرات نیک عمل سے زائل اور ختم ہوتے ہیں اس لیے لوگوں سے ملنے جلنے اور معاملہ کرنے میں گفتگو کا وہ انداز اپنانا چاہیے جس سے فریقِ ثانی یا مخاطب خوش اور مطمئن ہو، مثلاً بشاشت اور تواضع کا مظاہرہ کرنا، نرمی اور محبت سے پیش آنا۔ لوگوں پر اپنا مال خرچ کرنا، اُن سے کچھ تکلیف پہنچے تو اس کو برداشت کرنا۔ جو شخص یہ شعار اپنائے گا، اس کو دنیا میں بھی کامیابی حاصل ہوگی اور آخرت میں بھی نجات اور کامیابی سے سُرخرو ہوگا۔"

اس حدیث پاک میں تیسری بات حسنِ اخلاق کی کہی گئی ہے کہ لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ، اسی لیے سماج اور معاشرے کی تشکیل کے لیے پہلی بنیادی چیز اچھے اخلاق ہی ہیں کہ اسی سے اس کے تعلقات پروان چڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے ربط و تعلق میں

مضبوطی پیدا ہوتی ہے، اسلام نے تربیتِ انسانی کے لیے سب سے پہلے عبادت کی تعلیم دی، دوسرے نمبر پر برائیوں سے روکا اور اس کو چھپانے کا حکم دیا کہ جب کوئی برائی سرزد ہو جائے تو فوراً نیکی کر کے اس کے اثر کو مٹاؤ، اور ختم کرو کہ برائی کا غلبہ نہ ہونے پائے، اس کے بعد تیسرے نمبر پر ایک عام عمدہ اور پاکیزہ فکر و ذہن کے بنانے کی تعلیم دی حسنِ اخلاق کے اندر ایثار و قربانی، داد و دہش، ایک دوسرے کی مدد و تعاون، اچھی باتوں کو پھیلانا اور اس کی دعوت دینا سبھی کچھ آ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (میں حسنِ اخلاق کو مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ حسنِ اخلاق تمام انبیاء کرام کی دعوت رہی ہے۔ حسنِ اخلاق کے اس شاندار محل کی تعمیر میں، جس سے بلند انسانی تہذیبیں وجود میں آتی ہیں، ہر نبیؑ نے حصّہ لیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام انبیاء کرام کے بعد ہوئی اور آپ نے حسنِ اخلاق کے محل کی تکمیل فرمائی، اس وقت دنیا میں جو سماجی اور معاشرتی انارکی پائی جا رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حسنِ اخلاق کے مفہوم معانی اور اس کے نقوش، افراد، جماعتوں اور حکومتوں کے تعلقات میں محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔

اگر حکومتوں کے اندر عدل و انصاف کا فکر و ذہن پیدا ہو جائے جو اخلاق کی رُوح ہے تو جنگوں کی گرم بازاری ختم ہو جائے، بغض و کینہ کا ماحول نہ باقی رہے اور بعض سیاست دانوں کے بہ قول جنگل کا قانون نہ چلے، ان تمام حیثیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امر کا صیغہ استعمال فرمایا اور لفظ "ناس" پر الف لام داخل فرما کر اس کو روئے زمین کے تمام انسانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کو عام کر دیا۔ جب تعلقات اور دوستیوں کی بنیاد حُسنِ اخلاق پر ہو گی تو مادہ پرستی کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس جس نے حکومتوں کو مال کے ذخائر و پیداوار پر تسلط حاصل کرنے کے واسطے ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اس طرح مدہوش کر دیا ہے، جس طرح

درندے اپنے شکار پر جھپٹتے ہیں، ختم ہو جائے گی۔ یہ حکومتیں مال کی حریص اس لیے ہوتی ہیں کہ دوسروں پر انھیں اقتدار و غلبہ حاصل ہو، زمین کی پیداوار سے فائدہ اُٹھانا مقصود نہیں ہوتا۔

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ 'سیئۃ' سے مُراد چھوٹے گناہ ہیں۔ ان کا کفّارہ توبہ و استغفار، خدا کا ذکر اور نماز و صدقہ ہے۔

۲۔ 'سیئۃ' کا ذکر حدیث میں عموم کے ساتھ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صغیرہ اور کبیرہ دونوں گناہ اس میں شامل ہیں۔ بعض علماء اسی کے قائل ہیں۔ لیکن جمہور کا مسلک یہی ہے کہ 'سیئۃ' سے مراد گناہِ صغیرہ ہیں۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ انسان جہاں کہیں بھی ہو، کھلے چھُپے ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے اس کا پاس و لحاظ رکھے۔

۲۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب انسان سے کوئی خطا یا گناہ ہو جائے تو استغفار کرے، اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہے اور نیکی کرے، اس سے وہ خطا اور گناہ معاف ہو جائے گا اور اس کا بُرا اثر جاتا رہے گا۔

۳۔ حدیث میں یہ حکم بھی ہے کہ لوگوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آئے، ان کو تکلیف نہ پہنچائے۔

۴۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حسنِ اخلاق تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے۔

۲۷

سچّائی کے فائدے اور جھوٹ کے نقصانات

وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلعم، علیکم بالصدق، فان الصدق یھدی إلی البر، وإن البر یھدی إلی الجنۃ، ومایزال الرجل یصدق ویتحری الصدق حتی یکتب عنداللہ صدّیقاً، وایاکم والکذب، فان الکذب یھدی إلی الفجور، وإن الفجور یھدی إلی النار، وما یزال الرجل یکذب ویتحری الکذب حتی یکتب عنداللہ کذاباً۔ (متفق علیہ)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم سچ ہی بولا کرو، سچ بولنا تم پر لازم و فرض ہے، بلا شبہ سچائی نیکی کی راہ پر لے چلتی ہے اور نیکی جنت کی راہ پر لے چلتی ہے۔ آدمی سچ کو اپنا شعار بناتا ہے، برابر سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ صدّیقین میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اور تم جھوٹ سے بہت دُور رہو، جھوٹ نافرمانی کی راہ پر چلاتا ہے اور اس میں شُبہ نہیں کہ نافرمانی جہنم میں لے جاتی ہے، آدمی برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ ہی کی فکر میں رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔"

اس حدیث پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو قول و عمل، گفتار و کردار، ہر اعتبار سے سچائی اور صداقت کو اپنا شعار بنانے کا حکم فرما رہے ہیں، اس کا شوق و رغبت دلا رہے ہیں، اس لیے کہ سچائی اور صداقت ہی ایمان کا وہ جوہر ہے جو عملی

زندگی میں اور زندگی کے ہر شعبے میں دین اسلام کو حقیقت کے آئینے میں پیش کرتی ہے۔
اس حدیث پاک کا پڑھنے والا ہر شخص اس کے الفاظ میں ان بلندیوں کو محسوس کرے گا جن بلندیوں پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو لے جانا چاہتے ہیں تاکہ وہ اللہ کی زمین میں خلیفہ ہونے کی ذمہ داری سنبھالنے کا زندہ و جاوید نمونہ بن جائیں۔ اس لیے کہ ایمان صرف چند الفاظ کا نام نہیں ہے جن کو صرف زبان سے دہرایا جاتا رہے، بلکہ ایمان ایک حقیقت ہے، ہر سکون اور ہر حرکت میں نظر آتا ہے۔ ایمان ایک بارِ امانت ہے جس کے ساتھ بڑی ذمہ داری لگی ہوئی ہے۔ وہ ایسا جہاد اور جہد مسلسل ہے جو قول و عمل اور دل کے ارادے اور نیت سب کی سچائی اور حقیقی معنی کا محتاج و متقاضی ہے۔ اسی لیے ایک بزرگ نے فرمایا:

چوں می گویم مسلمانم بہ لرزم ؎ کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

صداقت اور سچائی کی اس اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے صدق اور صادق، سچ اور سچائی کو اپنا شعار بنانے والوں کا تذکرہ جگہ جگہ کیا ہے۔
دیکھیے ذیل کی آیت میں اللہ تعالیٰ صادقین کو خوش خبری دیتے ہوئے فرماتا ہے:

هذا یوم ینفع الصّادقین صدقهم۔ (المائدہ - ۱۱۹)

"آج وہ دن ہے کہ راست بازوں کو ان کی سچائی ہی فائدہ دے گی۔"

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

یا ایها الذین اٰمنوا اتقوا اللّٰه وکونوا مع الصّادقین۔ (التوبہ - ۱۱۹)

"اے اہل ایمان خدا سے ڈرتے رہو، راست بازوں کے ساتھ رہو۔"

ایک اور آیت میں سچے مسلمان مرد اور مسلمان عورت کا ذکر اس طرح ہے:

والصّادقین والصّادقات۔ (الاحزاب - ۳۵)

"اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں۔"

اللہ کے یہاں ان سچے مردوں اور عورتوں کا کتنا اونچا مقام ہے اس کی وضاحت

حدیث پاک میں اس طرح کی گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے خلوصِ دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت کی دُعا کی، اللہ تعالیٰ اس کو شہیدوں کے مرتبے پر پہنچائے گا خواہ اس کا انتقال میدانِ جہاد کے بجائے بسترِ علالت ہی پر کیوں نہ ہو۔" (مسلم)

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس بات میں شک اور تذبذب ہو اس کو چھوڑ دو اور جس میں شک و شبہ نہ ہو اس پر عمل کرو، اس میں شبہ نہیں کہ سچائی ہی اطمینانِ قلب ہے اور جھوٹ میں شک و تردد۔"

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں:

"میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مسلمان کس بات سے پہچانا جاتا ہے، جواب میں آں حضورؐ نے فرمایا: مسلمان اپنے وقار و تمکنت، نرم گفتاری اور سچ بولنے سے پہچانا جاتا ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"تم سچ ہی بولو، چاہے سچ بولنے کی پاداش میں قتل ہی کر دیے جاؤ۔"

بعض بزرگوں کا قول ہے کہ ہر چیز کی ایک زینت ہوتی ہے۔ اور گفتگو کی زینت سچائی ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے سچائی دین کا ستون، ادب کا رکن اور حوصلہ مندی کی جڑ ہے، یہ تینوں چیزیں صدق کے بغیر پوری نہیں ہو سکتیں۔"

صدق کی اتنی اہمیت اس لیے ہے کہ وہ ایسی روشنی ہے جو خیر و بھلائی کی تمام صُورتوں کو روشن کر دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کی راہوں کو منور کر دیتی ہے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچائی جنت کی راہ بتاتی ہے۔ ایسے ہی صدق کی اہمیت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو نیکی کی راہ دکھانے اور اللہ تعالیٰ کی راہ پر چلنے

اور اس کے حکموں کو زندگی کے میدان میں عملی جامہ پہنانے کا ذریعہ ہے۔

معلوم ہوا کہ صدق ایک مقدس امانت بھی ہے اور بہت بڑی ذمے داری وگراں باری بھی، اس لیے کہ صادق کو کبھی کبھی اپنی سچائی وراست گوئی اور حق پر ثبات قدمی کی وجہ سے بڑے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے، وہ اپنی امانت داری کی وجہ سے مشکلات ودشواریوں میں پڑ جاتا ہے کیوں کہ اس جہان فانی کے لیے یہی اللہ تعالیٰ کی سنّت اور قانون ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین۔ (العنکبوت-۳)

"اور جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں، ہم نے ان کو بھی آزمایا تھا (اور ان کو بھی آزمائیں گے) سو خدا ان کو ضرور معلوم کرے گا جو (اپنے ایمان میں) سچے ہیں اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں۔"

اس ابتلاء وامتحان کے بعد بندۂ مومن کی تسکین اور اس کے شرف وفضیلت کے لیے یہ بڑی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح تعریف کرتا ہے (اولئک الذین صدقوا و اولئک ھم المتقون) یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں، اور یہی ہیں جو (خدا سے) ڈرنے والے ہیں۔ (البقرہ-۱۷۷)

اور صادقین کے بالمقابل اللہ تعالیٰ جھوٹوں اور کاذبوں کو دردناک عذاب کی وعید سناتا ہے، فرماتا ہے:

ولھم عذاب الیم بما کانوا یکذبون۔ (البقرہ-۱۰)

"اور ان کے جھوٹ بولنے کے سبب ان کو دکھ دینے والا عذاب ہوگا۔"

دوسری آیت میں اس طرح ارشاد فرماتا ہے:

ویوم القیامۃ تری الذین کذبوا علی اللہ وجوھھم مسودۃ۔ (الزمر-۶۰)

"اور جن لوگوں نے خُدا پر جھوٹ بولا، تم قیامت کے دن دیکھو گے کہ ان کے منہ کالے ہو رہے ہوں گے"۔

حدیث پاک میں بھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اور جب کوئی بندہ جھوٹ بولتا ہے تو دونوں فرشتے جھوٹ کی گندگی اور بو کی وجہ سے ایک میل دور ہٹ جاتے ہیں یعنی منکر و نکیر۔

ایک روایت میں ہے کہ جھوٹی بات کو ادھر اُدھر نقل کرنے اور بیان کرنے والا بھی جھوٹوں میں شمار ہوتا ہے، جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ جھوٹ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ ہے اور جھوٹ کا ستون بہتان ہے اور ایک روایت میں ہے کہ دو باتیں جھوٹ سے خالی نہیں ہو سکتیں۔ بہت زیادہ وعدہ کرنا اور زور و تاکید کے ساتھ عذر پیش کرنا۔

اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹ سے ہم کو نہایت خوب صورت پیرایۂ بیان میں ڈراتے ہیں، فرماتے ہیں:

"تم جھوٹ سے بہت دُور رہو۔"

اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے، دل کے نیت و ارادہ اور حقیقتِ حال کو جانتا ہے، لہذا وہ لوگوں کا حساب ان کی نیتوں ہی کے اعتبار سے لے گا۔ جھوٹ کتنا ہی پوشیدہ اور چکنی چپڑی باتوں کی تہہ میں ہو اللہ تعالیٰ کے علم سے باہر نہیں جا سکتا۔ جھوٹ کی یہ شناعت اور بُرائی اور اس کا خبث جھوٹے کو انسانی معاشرے میں نہایت پستی میں پہنچا دیتا ہے، ذلّت اور رسوائی کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایمان کو کمزور بنا دیتا ہے، جھوٹے کے اندر بُزدلی اور کم ہمتی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ سماج اور معاشرے کی بلند کرداری سے عاری اور دُور ہو جاتا ہے۔ جب وہ جھوٹ ہی پر قائم رہتا ہے، اس بُری عادت سے باز نہیں آتا تو بدکرداریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے،

اس کا احساس وشعور کند ہو جاتا ہے، اس کے اندر حق و باطل میں فرق وتمیز کی صلاحیت باقی نہیں رہتی، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت صفوان بن سلیم کی روایت جس کو ان کے حوالے سے امام مالک نے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے تو آپؐ نے فرمایا "نہیں" اور یہ حدیث کہ "مومن سے سب خطائیں ممکن ہیں سوائے خیانت اور جھوٹ کے" حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے مخالف ہے ـــ اس شبہ اور اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حضرت صفوان کی روایت کا مطلب مومن کامل ہے کہ ایمان کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز بندۂ مومن جھوٹا نہیں ہو سکتا کہ اس پر جھوٹ کا غلبہ ہو جائے اور لفظ کذاب (بہت جھوٹا) کا مصداق ہے۔

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سوائے بہت اہم مواقع کے جھوٹ بولنا جائز نہیں ہے، مثلاً چند مواقع یہ ہیں، جنگ کے اندر، مسلمانوں میں صلح کرانے کے لیے۔

۲۔ تعریض وکنایے کے طور پر ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جس کا حقیقی مفہوم مراد ہو، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ فرمانا: (إنی سقیم) میری طبیعت ناساز ہے۔ طبری نے اپنی سند سے حضرت عمر بن الخطاب سے روایت کی ہے کہ بطور تعریض خلاف واقعہ بات کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے، حاصلِ کلام یہ کہ اضطراری حالت میں تعریضاً کوئی بات کہی جا سکتی ہے۔

۳۔ اگر دو مسلمانوں میں جن کا آپس میں مقاطعہ ہو چکا ہے، میل ملاپ اور جوڑ پیدا کرنے کے لیے جھوٹ بولا جائے تو یہ جھوٹ عیب نہیں ہے۔ اسی طرح شوہر اور بیوی کے تعلقات درست کرنے کے لیے جھوٹ بولنا بھی عیب نہیں۔ اور اگر سچ بولنے میں غیبت کا پہلو آ رہا ہو تو سچ بھی قابل مذمت ہے۔ جنگ کے موقع پر اور زوجین میں صلح کرانے

ولے سے جھوٹ معاف ہے، خوارج کی جنگ میں مہلب اپنے ساتھیوں سے جھوٹ بول کر ان کا دل مضبوط کرتے تھے۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ سچ مومن کی ایسی صفت ہے کہ جس کے اندر یہ نہ پائی جائے وہ اُمتِ مسلمہ سے خارج ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (انما یفتری الکذب الذین لا یؤمنون بایات اللہ) جھوٹ کا افترا تو وہی لوگ کیا کرتے ہیں جو خدا کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے۔

۲۔ صدق وہ نقطۂ اتصال ہے جو انسان کی تمام سرگرمیوں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے عقیدے میں جوڑ پیدا کرتا ہے اور دل کے اندر ہر وقت اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت کا شعور بیدار رکھتا ہے۔

۳۔ مومنِ کامل کی شخصیت کی تعمیر میں صدق کے لفظی و عملی دونوں معانی باہم معاون ہیں۔

۲۸

جنّت کا آسان راستہ

عن أبی عبد اللہ جابر بن عبد اللہ الأنصاری رضی اللہ عنہما: أن رجلا سأل رسول اللہ صلعم فقال: ارأیت اذا صلیت المکتوبات وصمت رمضان، وأحللت الحلال، و حرمت الحرام ولم ازد علی ذٰلک شیئاً، أدخل الجنّة؟ قال: نعم: قال: واللہ لا ازید علی ذٰلک شیئاً۔ (رواہ مسلم)

حضرت ابو عبد اللہ جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، اس نے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ آپ بتائیں کہ اگر میں پانچوں وقت کی فرض نمازیں پڑھ لوں، رمضان المبارک کے روزے رکھوں، حلال کو حلال سمجھوں اور حرام کو حرام (یعنی حلال اور جائز کاموں کو کروں اور حرام و ناجائز کاموں سے بچوں) اس سے زیادہ کچھ اور نہ کروں تو جنت میں داخل ہو جاؤں گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں تم جنّت میں داخل ہو جاؤ گے"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب سُن کر اس شخص نے کہا، خدا کی قسم میں اس میں کچھ اضافہ نہ کروں گا۔

❋

دین اسلام کے اندر سہولت و آسانی کے نمونوں میں سے ایک اچھا نمونہ ہے، ایک سائل آتا ہے اور بڑی سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ سوال کرتا ہے: اللہ کے رسولؐ آپ فرمائیں کہ اگر میں عبادت والے شعائر کو ادا کرلوں اور پوری عمر حرام و حلال کا لحاظ رکھوں، اس

پر کاربند رہوں، تو کیا میرے لیے جنت کا راستہ آسان ہو جائے گا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مشفقانہ اور کریمانہ جواب میں سائل کو خوش خبری دیتے ہوئے فرماتے ہیں "ہاں"۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک عملی نظامِ حیات اور بہت ہی آسان طریقۂ زندگی ہے، اسلام یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تنِ تنہا ساری مخلوق و کائنات کا مالک و خالق ہے اور تنہا وہی عبادت کے لائق ہے اور خدا اور بندے کے ربط و تعلق کو شعائرِ عبادت، نماز اور روزہ اور حرام و حلال کی پابندیوں پر عمل کے ذریعے قوت بخشتا ہے اور یہ چیز طبعی اور فطری طور پر ایک ایسے اسلامی معاشرے کے قیام کی طالب ہے جس کے سائے میں ایک مسلمان اپنے دین اور ان اچھے اطوار و عادات کے ساتھ زندگی گزارے جن کی یہ دین رہ نمائی کرتا ہے تو لازماً ایک ایسا ماحول و معاشرہ پایا جائے گا جو اس عقیدے اور تصوّر کی تمام قدروں کے ساتھ زندگی گزارتا ہو، اس پاکیزہ معاشرے میں نیکی اور فضیلت ہی وہ خوبی ہو گی جس کو اس معاشرے میں رہنے والے تمام لوگ جانتے اور اس کو اپناتے ہوں گے۔ بُرائی، رذالت اور گندگی (منکر) ناپسندیدہ اور بُری بات قرار پائے گی جس کو اس معاشرے کی ہر شے رد کرے گی جب معاشرہ اس معیار پر آجائے گا تو زندگی کے لیے اسلامی دستور ایک آسان دستور بن جائے گا۔ اس ماحول و سوسائٹی میں مسلمان فطری اور راحت بخش زندگی گزارے گا، اس لیے کہ وہ اس ماحول میں طبعی اور فطری سانس لے گا۔ اس کو نیکی کے کاموں کے لیے معاونین مل جائیں گے جو حلال کو حلال سمجھنے اور حرام کو حرام سمجھنے میں اس کی مدد کریں گے۔ دراصل اسلامی اخلاق پر کاربند اور عمل پیرا ہونے میں حسی اور معاشرتی دونوں طرح کی راحت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب سن کر اس ماحول و فضا میں پہنچ گیا اور یہ مثالی معاشرہ اس کا مشاہدہ بن گیا اور اس نے سکون و راحت محسوس کیا چناں چہ بول اُٹھا: خدا کی قسم میں اس میں کوئی اضافہ نہ کروں گا۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ جس نے واجبات کو ادا کیا اور حرام کاموں سے بچا، وہ جنت میں داخل ہو جائے گا، اس مفہوم میں یا اسی کے قریب قریب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی احادیث وارد ہیں، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابوہریرہ اور ابوسعید رضی اللہ عنہما کی حدیث کی تخریج کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر وہ بندہ جو پنج وقتہ نماز پڑھتا ہو، رمضان المبارک کے روزے رکھتا ہو، زکوٰۃ ادا کرتا ہو، ساتوں کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو، اس کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جس دروازے سے چاہے، جنت میں داخل ہو جائے، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

"اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا" (نساء-۳۱)

اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے، اجتناب رکھو گے تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے اور تمہیں عزت کے مکانوں میں داخل کریں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا گیا ہے: کہ ضمام بن ثعلبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد لے کر آئے تو آپ نے پانچوں نمازوں، روزہ، زکوٰۃ، حج اور تمام اسلامی احکام کو بیان فرمایا جب آپ بیان فرما چکے تو انھوں نے کلمۂ شہادت پڑھا "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" اور کہا میں ان فرائض کو پورا کروں گا اور ان تمام باتوں سے بچوں گا جن سے آپ نے ہم کو منع فرمایا ہے۔ نہ اس میں زیادتی کروں گا نہ کمی، آپ نے ان کی بات سن کر فرمایا اگر یہ مخلص اور سچا ہے تو جنت میں داخل ہو گیا۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول آپ مجھ کو کوئی ایسا عمل بتا دیجیے کہ جب میں اس کو کر لوں تو

جنت میں داخل ہو جاؤں۔ آپؐ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، فرض نمازیں اچھی طرح پڑھو، فرض زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو۔" آپ کا ارشاد سن کر اس اعرابی نے کہا، اُس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو حق دے کر بھیجا ہے، اِس میں میں کبھی کوئی چیز نہ بڑھاؤں گا نہ کمی کروں گا، پھر جب وہ واپس ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کو کسی جنتی کو دیکھنے سے خوشی ہو، وہ اس شخص کو دیکھے۔"

اس اعرابی کا مطلب یہ تھا کہ فرض نمازوں، زکوٰۃ، رمضان کے روزوں، حج بیت اللہ میں نفل کا اضافہ نہ کرے گا، اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کے علاوہ دیگر اسلامی احکام اور واجبات پر بھی عمل نہ کرے گا۔

ان احادیث میں حرام چیزوں کا ذکر نہیں ہے، اس لیے کہ سوال کرنے والے نے ان اعمال کے بارے میں پوچھا تھا، جن پر عمل کرنے والا جنت میں داخل ہو جائے گا، جنت میں داخلے کی خوش خبری ان اعمال میں سے بعض پر عمل کرنے سے بھی دی گئی ہے، مثلاً نماز، مشہور حدیث میں ہے:

> "جس نے وقت پر نمازیں ادا کیں اس کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ حق حاصل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے۔"

جیسا کہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب جنت میں داخل ہونے سے روک دے گا، مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "رشتوں کا توڑنے والا جنت میں نہیں داخل ہو گا۔" ایسے ہی آپ کا یہ ارشاد کہ "جس کے دل میں ذرہ برابر کبر ہو گا، وہ جنت میں نہیں داخل ہو گا۔"

حدیث کا فقہی پہلو

۱۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ جب مسلمان ارکان اسلام اور ایمان سمجھ لے اور

اپنے اُوپر واجب فرائض کو ادا کرے تو گویا وہ جنّت کے راستے پر چل پڑا۔

۲۔ حدیث میں حج اور زکوٰۃ کا ذکر نہ ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل حج اور زکوٰۃ کی ادائی پر قادر نہیں تھا، یہ دونوں چیزیں ان میں شامل ہیں جو حرام و حلال کہلاتی ہیں گو اس حدیث میں مذکور نہیں۔

۳۔ یہاں حلال سے مُراد وہ چیزیں ہیں جو حرام نہیں ہیں لہذا واجبات و مستحبات اور مباح سب اس میں شامل ہیں۔

۴۔ علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ کلمۂ توحید کا اقرار جنت میں داخلے اور آگ سے نجات کا سبب و مقتضا تو ہے لیکن اس کے لیے شرائط ہیں یعنی فرائض کی ادائی اور جنت میں داخلے سے رکاوٹ بننے والی چیزوں یعنی گناہ کبیرہ سے بچنا، حضرت حسن نے فرزدق سے کہا: لا الٰہ الا اللہ کے کچھ شرائط ہیں، تم کسی پاک دامن پر بہتان لگانے سے بہت دور رہو۔

موجودہ حالات اور حدیث

۱۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام آسانی اور سہولت کا دین ہے وہ انسانوں کو اس مشقت سے زیادہ مشقت کا مکلف نہیں بناتا جس کو وہ جاہلی قوانین میں جھیل رہے تھے۔

۲۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام تربیت کے سلسلے میں افراد کے حالات کے اعتبار سے تربیت کی خوراک دیتا ہے۔ اسی لیے اس حدیث میں آپؐ کا جواب مختصر اور جامع تھا، جو سائل کے حالات کے مطابق تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی اور مربّی کو مخاطب کے حالات و ماحول کی پوری رعایت کرنی چاہیے تبھی وہ تربیت میں کامیاب ہوگا۔

۳۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنن و نوافل کا ذکر نہیں فرمایا اس لیے

کہ سائل ابھی قریب ہی مدت میں اسلام لایا تھا بہت سی باتوں کو اس سے کہنا اس کو مشکل معلوم ہوتا اور وہ گھبرا جاتا، دین پر عمل کرنا اس کو مشکل معلوم ہوتا۔ آج کے موجودہ ماحول میں دعوت کا کام کرنے والوں کو اس اسلوب دعوت کو اپنانے کی کتنی شدید ضرورت ہے کہ وہ مخاطب کے مزاج وطبیعت اور اس کی نفسیات کی پوری رعایت کرتے ہوئے اس کو مخاطب کرے۔

آیتِ کریمہ میں بھی اسی کا اشارہ ملتا ہے:

"اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ" (النحل - ۱۲۵)

(اے پیغمبر) لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے راستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔

۲۹

گُناہِ کبیرہ

عن ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلعم " ألا أنبئکم بأکبر الکبائر؟ قلنا: بلی، یا رسول اللہ، قال: الاشراك باللہ، وعقوق الوالدین، وکان متکئاً فجلس، فقال ألا و قول الزور و شہادۃ الزور، ألا و قول الزور و شہادۃ الزور، فما زال یقولہا حتی قلت: لا یسکت۔ (متفق علیہ)

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑے گناہ نہ بتادوں؟ ہم لوگوں نے عرض کیا، اللہ کے رسول ضرور بتائیں! آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگائے ہوتے تھے، بیٹھ گئے پھر فرمایا: ہوشیار ہو جاؤ، غور سے سنو، اس کے بعد سب سے بڑا گناہ جھوٹ بات اور جھوٹی گواہی ہے، سُن لو اس کے بعد جھوٹ بات اور جھوٹی گواہی ہے، برابر آپ یہی فرماتے رہے یہاں تک کہ ہم نے اپنے دل میں کہا کاش آپ خاموش ہو جاتے۔"

یہ حدیث متمدن معاشرہ کو اسلامی معیار سے خدائی قدروں کے ذریعہ ترقی دینے اور آگے بڑھانے کی شکلوں میں سے ایک شکل، اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم اور اس کی وضاحت و بیان کی ایک کھلی ہوئی مثال ہے، اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات قرآنیہ میں اپنی عبادت کے بعد فوراً والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کا ذکر فرمایا ہے، فرمایا:

"وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا"۔ (الاسراء۔ ۲۳)

اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی (کرتے رہو)۔

اسی طرح سے اس کے برعکس جہاں اپنی ذات کے ساتھ شرک کو سب سے بڑا گناہ فرمایا وہیں فوراً والدین سے قطع تعلق کو بھی گناہ کبیرہ فرمایا تاکہ مسلمانوں کی یہ علامت وپہچان بن جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے اور والدین سے قطع تعلق نہیں کرتے، اللہ پاک کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ناپاکی اور گندگی ہے جو ضمیر کو بیمار اور دل کو داغدار کر دیتی ہے اور اس کی صفائی وطہارت کو اس طرح پراگندہ کر دیتی ہے، جس طرح نجاست کپڑے اور جگہ کو ناپاک وگندا کر دیتی ہے، اس لیے کہ شرک اللہ تعالیٰ پر جھوٹ اور افترا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر قسم کے جھوٹ سے ڈراتا ہے، فرمایا:

"فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ"۔ (الحج۔ ۳۰)

تو بتوں کی پلیدی سے بچو اور اس جھوٹی بات سے اجتناب کرو۔

آیت قرآنی نے شرک کے بعد معاً جھوٹ کا ذکر کر کے اس جرم کی شناعت و پلیدی کو خوب واضح کر دیا۔

اسی طرح سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث مذکور میں لوگوں کو ہر قسم کے جھوٹ سے دور رہنے کا منشا ظاہر فرمایا ہے اور اپنے انداز کلام اور اسلوب بیان میں اس پر زور دیا ہے، اور یہ تعلیم دی ہے کہ ہم سچی توحید پر کاربند ہو جائیں، ہر طرف سے کٹ کر اللہ تعالیٰ ہی کے ہوں، اس کے ساتھ قطعاً کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اس کے بعد آپ بڑی قوت وسختی کے ساتھ اس کی خطرناکی کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں کہ آپ ٹیک لگائے ہوئے تھے، سیدھے بیٹھ گئے، اور فرمایا: "سن لو جھوٹی بات" اور اسی کو تین مرتبہ دہرایا، ظاہری الفاظ اور معانی سے یہ واضح ہے کہ ایک صورت تو یہ کہ مسلمان جھوٹی گواہی اس لیے نہیں دے سکتا کہ جھوٹی گواہی سے

دوسرے کا حق مارا جاتا ہے اور اس میں ظالم کی مدد ہوتی ہے اور کبھی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی مجلس میں لوگ جھوٹی اور بے بنیاد باتیں کر رہے ہیں اس سے بچنے لیے آدمی وہاں سے اُٹھ کر چلا جائے کہ ایسی مجلس سے بچے جہاں یہ سب لغویات ہو رہی ہوں۔

حدیث کا فقہی پہلو

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ گناہ کبیرہ ہر وہ گناہ ہے جس کا ذکر نار (آگ) یا لعنت یا عذاب پر ختم ہو رہا ہو، ہاں گناہِ کبیرہ سرزد ہو جانے کے بعد فوراً توبہ واستغفار کر لینے سے وہ گناہ کبیرہ نہیں رہ جاتا، ایسے ہی صغیرہ گناہ بار بار کرتے رہنے سے گناہِ کبیرہ بن جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ" (نساء - ۳۱)

ان بڑے گناہوں سے جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے اجتناب رکھو گے تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے۔

سب سے بڑا گناہ کبیرہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنا ہے اس کے بعد کسی کو قتل کر دینا، پھر زنا، اللہ تعالیٰ کے ارشاد پاک میں یہی ترتیب ہے، فرمایا:

"وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ" (الفرقان - ۱۸)

اور وہ جو خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جان دار کا مار ڈالنا خدا نے حرام کیا ہے، اس کو قتل نہیں کرتے مگر جائز طریق پر (یعنی حکم شریعت کے مطابق) اور بدکاری نہیں کرتے۔

گناہ چھوٹا بھی ہو تو بار بار کرنے سے بڑا بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ تکرار سے دل بے حس ہو جاتا ہے اور گناہ کی جرأت بڑھتی جاتی ہے۔

---

(۳۰)

اچھّے مسلمان کی پہچان

عن ابی ھریرۃ، قال: قال رسول اللہ صلعم "من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ" (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انسان کے اچھا مسلمان ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ لایعنی (بے ضرورت) باتوں کو چھوڑ دے۔"

یہ حدیث ادب و تربیت کے اصولوں میں بہت بڑی اصل (جڑ) ہے۔ امام ابوعمرو ابن الصلاح نے ابوالحسن بن ابوزید سے جو اپنے زمانے میں مالکی مسلک کے امام تھے، بیان کیا ہے کہ تمام اچھے آداب اور خیر کی باتیں چار حدیثوں سے نکلتی اور ثابت ہوتی ہیں، انھیں چار حدیثوں میں اس حدیث کو بھی شمار کیا ہے، باقی تین حدیثیں یہ ہیں: آپؐ کا ارشاد کہ:

(۱) "جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، بولے تو اچھی بات بولے ورنہ خاموش رہے۔"

(۲) آپؐ کا ارشاد کہ: "غصہ مت کرو۔"

(۳) آپؐ کا ارشاد کہ: "مسلمان اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرتا ہے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

یہ حدیث جس کا اوپر ذکر ہوا ان چاروں حدیثوں کے مفہوم پر حاوی اور اس کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کے اسلام کی خوبی اور اچھائی یہ ہے کہ بے ضرورت اور غیر مفید باتوں میں وقت ضائع نہ کرے بلکہ اس سے

بچے اور دور رہے، خواہ گفت گو ہو یا کوئی اور عمل ہو، لفظ (یعنی) کا مطلب ہے قابل توجہ اور مفید بات۔

عنایت کا مطلب ہے کسی چیز کو فکر و اہتمام کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کرنا، یہ مطلب نہیں ہے کہ جس چیز کی طرف اس کی طبیعت نہ چلے اس کی رغبت نہ ہو اس کو چھوڑ دے بلکہ یہاں مُراد حکم شرعی ہے کہ شریعت کی رو سے جو چیز غیر مفید اور نا قابل توجہ ہو اس میں وقت نہ ضائع کرے، اسی لیے اس کو اسلام کی خوبی بتایا ہے۔

یہ حدیث مسلمان کے اعلیٰ معیارِ انسانیت کا نقشہ پیش کرتی ہے، نمونے کا معیار، مخلوق خدا میں سب سے بہتر ہونے کا معیار، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لیے بہترین نمونہ تھی۔ آپؐ کو تربیت کرنے اور آپؐ کو ادب سکھانے کا کام اللہ تعالیٰ نے کیا اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ادب سکھایا ہو اس کے حسنِ اخلاق اور ادب کا معیار و مرتبہ کیا ہوگا؟ اس کی شہادت خود کتاب خداوندی نے اس طرح دی ہے:

"اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔"

اس خلق عظیم کا اعلیٰ مظہر (صورت) گھٹیا اور رذیل باتوں سے بلند اور دُور ہونا اور بے فائدہ کاموں سے بلند رہنا ہے، حقیقی معنی میں یہی بلند اور عظیم صفات ہیں۔ مومن کے گفتار و کردار کا مہمل و لغو ہونا اور ایسے کاموں کی فکر کرنا، اس کے اندر اس کے احساسات کا پایا جانا اس کے شایانِ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

لہٰذا بندۂ مومن کے دل کو ان خیالات تک سے بے نیاز ہونا چاہیے جو لغو و بے کار اور کھیل تماشا ہوں۔

اور جب مومن کا اسلام اچھا ہوگا تو وہ ان سب چیزوں کی طرف سے بے اعتنائی برتے گا، جو خدا کی یاد سے غافل کرنے والی ہیں، ان چیزوں کی طرف نظر بھی نہ اُٹھائے گا۔ اور جو چیزیں اللہ کی کتاب اور خود نفس انسانی اور آفاق میں پھیلی ہوئی اس کی نشانیوں اور مظاہر قدرت پر، جو عقل کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں جنھیں دیکھ کر انسان سوچ

یں پڑ جاتا ہے اور اس کے وجدان یں حرکت پیدا ہو جاتی ہے ، غور کرنے یں رکاوٹ بنتی ہوں ، ظاہر ہے کہ بندۂ مومن ان لایعنی باتوں یں کیسے مشغول ہو سکتا ہے جب کہ وہ عقیدے کی ذمہ داریوں ، صفائی قلب ، تزکیۂ نفس ، ضمیر کی ترقی اور تربیت و سلوک یں مشغول ہے ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد کے ذریعے کہ " جو شخص آخرت پر ایمان رکھتا ہو ، بولے تو بھلی بات بولے ورنہ خاموش رہے ۔"

جب مومن کا اسلام اچھا ہو جائے گا تو وہ لایعنی (یعنی) مشتبہات ، مکروہات اور ایسی بے کار و مباح چیزیں جن کی اس کو ضرورت نہیں ، کی کوئی پروا نہ کرے گا وہ ادھر نظر بھی نہ اُٹھائے گا ، بلکہ انھیں بلندیوں پر ثابت قدم رہنے کی تدابیر کرے گا ، جن کا ایمان مطالبہ کرتا ہے ، یہ مرد مومن جو فرد ہے وہ جماعت یا معاشرے کے محل کی ایک پختہ اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور جماعت و سماج کی زندگی ان تمام باتوں سے دور رہنے کا مطالبہ کرتی ہے جو بے کار محض ہوں ، یعنی فساد و بگاڑ ، دینی کاموں سے پھر جانا ، جہاد فی سبیل اللہ کی مشقتیں جھیلنا ، دُشمنوں کے مکر و چال سے بچنے کے لیے محاذ جنگ پر جاگنا ، عقیدے کی وہ اہم چیزیں ہیں جو گھٹیا باتوں سے بہت بلند اور دُور رہنے کی متقاضی ہوتی ہیں ، جماعت سے متعلق فرد کی ذمہ داریاں ختم نہیں ہو سکتیں ، مسلمان کبھی اس سے چھٹی نہیں لے سکتا ، نہ اس سے اپنے آپ کو الگ کر سکتا ہے یہ اس پر فرض ہے ، بعض حالات میں فرض عین اور بعض حالات میں فرض کفایہ انسانی کا وشوں کے ان کاموں میں مشغول ہونے کے بعد لایعنی کے لیے اس کے پاس وقت کہاں بچ سکتا ہے ، اس سے یہ نہیں لازم آتا کہ مسلمان کبھی کبھی یا کسی وقت نفس کو راحت پہنچانے ، نشیط بنانے کے لیے تفریح طبع بھی نہ کرے یہ ایک الگ باب ہے ؛ جو احتیاط ، لغو و مہمل اور لایعنی باتوں سے تعلق نہیں رکھتا ، وہ زندگی کی ایک ضرورت ہے اس کے لیے حدیث پاک یں الگ ہدایت و رہنمائی ہے ۔

حکمت و نصیحت کی باتوں یں ایسی چیزیں بھی بیان ہوئی ہیں جو اس حدیث کے مضمون

سے قریب ہیں یا اس سے ملتی جلتی ہیں، انھیں باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت لقمان سے پوچھا گیا کہ یہ حکمت و دانائی اور فضل و کمال آپ کو کیسے حاصل ہوا تو اُنھوں نے جواب دیا۔ سچائی، امانت داری اور بے فائدہ باتوں سے دوری و پرہیز نے ہم کو شرف و فضیلت کے اس مرتبے پر پہنچایا۔

حضرت حسن سے مروی ہے کہ آپؓ نے فرمایا:

"بندے سے اللہ تعالیٰ کی ناراضی کی ایک پہچان یہ ہے کہ بندہ بے فائدہ کاموں میں مشغول ہو جائے۔"

اور بھی بہت سی ایسی چیزیں کتابوں میں موجود ہیں۔ حدیث پاک میں جو کچھ ہے وہ حقیقت کی وضاحت و بیان اور ہدایت کے سلسلے میں سب سے بلند معیار رکھتی ہے کہ اس کا درجہ وحی کا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

" مَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ "

حدیث کا فقہی پہلو

بے ضرورت اور غیر مفید کاموں سے یعنی لغو چیزوں سے بچنا چاہیے خواہ وہ قول ہو یا فعل و عمل۔

حضرت ابن عباسؓ کے مطابق "اللغو" غلط بات یا کام کو کہتے ہیں۔ وہ بات جس میں کوئی فائدہ نہ ہو غلط ہے۔ گو اس باطل سے کوئی وقتی اور فوری فائدہ حاصل ہو رہا ہو۔

موجودہ حالات اور حدیث

حدیث اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ مسلمان کو مہمل اور غلط کاموں اور باتوں سے ہر وقت بچنا چاہیے، اس میں خصوصیت کے ساتھ نماز کا وقت بھی شامل

ہے، جس چیز سے مسلمان کو فائدہ نہ ہو، اس کا چھوڑ دینا دُنیا اور آخرت کی کامیابی کا ضامن ہے۔

اس میں فرد کی بھی کامیابی ہے اور مسلمان معاشرے اور جماعت کی بھی۔ وہ کامیابی جس کو مسلمان اپنے دل سے محسوس کرتا ہے اور عملی زندگی پر اس کے اثرات پڑتے ہیں۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث اس بندۂ مومن کو سامنے لانا چاہتی ہے، جس کے لیے وہ بہترین زندگی مقدر ہے، جو اس انسان کے شایان شان ہے، جس کو اللہ تعالیٰ منزل بہ منزل کمال کے درجے کو پہنچانا چاہتا ہے۔

پہلی حدیث کے راوی ــ حضرت عمر فاروق رضؓ

امیرالمومنین حضرت عمر فاروق، ابوحفص عمر بن الخطاب رضؓ بن نفیل القرشی العدوی۔ آپ بعثت نبوی کے چھٹے سال اس وقت ایمان لائے جب کہ مسلمانوں کی تعداد ابھی تیس اور ۳۹ کے درمیان تھی اور یہ حضرات دار ارقم بن ارقم مخزومی میں جمع ہوتے تھے اور دین اسلام کی باتیں کیا کرتے تھے آپ کا اسلام لانا مسلمانوں کی بڑی کامیابی اور دعوتِ حق کا سہارا اور دین خداوندی کے لیے بڑی طاقت کا موجب تھا، آپ اپنے اثر ورسوخ اور طاقت و قوت میں مشہور تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضؓ کا اسلام لانا دعوتِ اسلامی کے لیے راہ ہموار ہونے کا فتح باب تھا۔ آپ کی ہجرت اسلام کی مدد و نصرت تھی، آپ کی خلافت باعث رحمت تھی، آپ کے اسلام سے پہلے ہمارا یہ حال تھا کہ اپنے گھر میں بھی نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ لیکن آپ اسلام لائے تو کفّار کا مقابلہ کیا حتیٰ کہ انہوں نے ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ دیا اور ہم آزادی کے ساتھ نماز پڑھنے لگے۔ وہ مسلمانوں کی طرف سے برابر لڑتے رہے اور حضورؐ کی حفاظت فرماتے رہے یہاں تک کہ ہجرت کی اجازت مل گئی۔ ہجرت کی اجازت ملنے کے بعد عام مسلمانوں نے تو چھپ چھپا کر ہجرت کی، لیکن حضرت عمر رضؓ نے قریش پر اپنے رعب و دبدبہ کی وجہ سے علی الاعلان ہجرت کی۔

یُوں تو حضرت عمر رضؓ کی شخصیت گوناگوں صلاحیتوں کی مالک تھی۔ لیکن ان کی سب سے اہم خصوصیت رائے کی پختگی، دُور اندیشی، باریک بینی اور مردم شناسی کی صحیح فہم وفراست تھی، ثقہ لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے فرمایا: تین باتیں بالکل اسی طرح میرے دل میں آئیں جیسی اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی۔ یا اللہ تعالیٰ کی تین باتیں بالکل میری رائے اور خیال کے مطابق پیش آئیں، ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ کیا بہتر ہوتا کہ آپؐ مقام ابراہیم

کو نماز کی جگہ بنا دیتے، چناں چہ یہ آیت نازل ہوئی (وا تخذوا من مقام ابراھیم مصلیٰ) (بقرہ: ۱۲۵) (حکم دیا) جس جگہ پر ابراہیمؑ کھڑے ہوتے تھے اس کو نماز کی جگہ بنا لو۔ ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ آپ کے پاس اچھے برے ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، بہتر ہوتا کہ آپ اُمّہات المومنین کو پردے کا حکم فرماتے، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے پردے کی آیت نازل فرمائی۔

فرماتے ہیں کہ جب مجھے پتا چلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض ازواج مطہرات سے ناراض ہیں تو میں ان کے پاس گیا اور کہا، اگر تم لوگ باز آتی ہو تو تمہاری قسمت ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے بدلے حضورؐ کو تم سے بہتر بیویاں دے گا، چناں چہ یہ آیت نازل ہوئی (عسیٰ ربہ إن طلقکن أن یبدلہ أزواجا خیرا منکن مسلمات) (تحریم - ۵) اگر پیغمبر تم کو طلاق دیدیں تو عجب نہیں ان کا پروردگار تمہارے بدلے ان کو تم سے بہتر بیویاں دیدے۔

اسی کے ساتھ دیکھیے کہ حضرت عمرؓ نے مقدمات کے فیصلے کے سلسلے میں حضرت ابوالحسن اشعری کو جو خط لکھا ہے وہ قضا کے سلسلے میں غیر معمولی خط ہے، جو اصول وفقہ اور احکام کے استنباط کے بہت سے اصول وقواعد کا جامع ہے جس سے آپ کی اصابت رائے باریک بینی اور حسن بصیرت کا پتا چلتا ہے۔ ابن قیمؒ نے اپنی کتاب (أعلام الموقعین) میں اس کی بڑی تفصیل وتشریح کی ہے، حضورؐ سے آپ کی ۵۳۷ حدیثیں بیان کی گئی ہیں۔

دوسری حدیث کے راوی ۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ

سلسلۂ نسب یہ ہے نعمان بن بشیرؓ بن سعد بن ثعلبہ، کنیت ابو عبد اللہ تھی اور وہ انصاری تھے، ان کا تعلق بنو خزرج سے تھا اور وہ گورنر بھی رہے، وہ عالم، شاعر صحابی تھے اور صحابی کے بیٹے تھے، شعری صلاحیت واستعداد اپنے ماموں سے وراثت میں پائی تھی، اپنے اشعار کو قرآنی رنگ میں رنگنے کے سلسلے میں انہوں نے اپنے ماموں عبد اللہ بن رواحہ کا طریقہ اپنایا۔ ہجرت کے بعد انصار میں سب سے پہلی ولادت آپ کی ہوئی۔ حضورؐ کی ہجرت کے چودہ ماہ بعد ربیع الآخر میں آپ کی ولادت ہوئی، کوفہ میں حضرت امیر معاویہؓ کے گورنر رہے اور وہاں کی اقامت اختیار کرلی، کچھ عرصے بعد حضرت امیر معاویہؓ نے ان کو معزول فرما دیا تو وہ شام چلے گئے، جب معاویہ بن یزید بن معاویہ ابن ابی سفیان کا انتقال ہوگیا تو شام میں لوگوں کو عبد اللہ بن زبیرؓ کی بیعت کی دعوت دی، لیکن اہل حمص نے آپ کی مخالفت کی تو وہاں سے نکل جانے کی کوشش کی مگر ان لوگوں نے پیچھا کرکے قتل کردیا، یہ واقعہ ذی الحجہ ۶۴ھ میں مروان بن حکم کے زمانے میں پیش آیا۔ ان کے والد بشیر بن ثعلبہ صحابی تھے اور اپنے بیٹے نعمان کو حضورؐ کی خدمت کے لیے وقف کردیا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (کیا تم نے اپنے لڑکوں کو اس طرح دے دیا ہے؟ انہوں نے کہا، نہیں، تو آپؐ نے فرمایا، اس کو واپس لے جاؤ)۔

حضرت نعمانؓ اپنی صغر سنی کے باوجود حضورؐ کی مجلس میں آیا جایا کرتے تھے اور آپؐ کے ارشادات ونصائح کو سُنا کرتے تھے اور آپؐ کی حدیثوں کو یاد کیا کرتے تھے، جو حدیثیں انہوں نے روایت کی ہیں انہیں میں سے یہ روایت بھی ہے کہ میں نے حضورؐ کو فرماتے ہوئے سُنا (حلال اور حرام واضح ہیں، ان دونوں کے درمیان کچھ ایسی چیزیں

ہیں جو مشتبہ اور غیر واضح ہیں) الخ۔

حضرت نعمانؓ مختلف خداداد صلاحیتوں سے بہرور تھے۔ انھیں میں سے شعر گوئی، خطابت اور حدیثوں کا یاد کرنا بھی ہے۔

سماک بن حرب نے فرمایا: ہم نے جن لوگوں کی تقریریں سُنی ہیں ان میں نعمان بن بشیرؓ سب سے فائق تھے۔ مؤرخین ان کو متفقہ طور پر کم سن صحابہ میں شمار کرتے ہیں جو بچے تھے، وہ اپنے شریفانہ اخلاق و کردار جود و سخا اور بہادری میں مشہور تھے۔

تیسری حدیث کے راوی ـ حضرت ابو مالک اشعری رضؓ

ابو مالک اشعریوں کے ساتھ کشتی پر سفر کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے اور حضورؐ کے دست مبارک پر اسلام قبول فرمایا اور ایک عرصے تک آپ کے پاس ٹھہرے رہے تاکہ غزوات وسرایا میں شریک ہوں اور حضورؐ کی سفر و حضر کی مجلسوں سے استفادہ کریں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بعض سریوں کا ذمہ دار بنایا۔

ابو مالک حضورؐ کی مبارک مجلسوں سے استفادے کا نہایت شوق رکھتے تھے، صحبت نبویؐ سے خوب فیض اُٹھاتے اور اس چشمۂ صافی سے آسودہ وسیراب ہوتے، وہ خود فرماتے ہیں کہ میں خدمت نبویؐ میں حاضر تھا کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (یا أیّھا الذین آمنوا لاتسألوا عن اشیاء إن تبد لکم تسؤکم) ابو مالک کے اس بیان اور آیت دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آیات کے نزول کے وقت بھی خدمت اقدس میں حاضر رہتے تھے اور اس وقت کے مناظر کا مشاہدہ کرتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے بندے ہیں جو نہ ولی ہیں اور نہ شہید لیکن قیامت کے دن ان کو اللہ تعالیٰ کا ایسا قرب حاصل ہوگا کہ ان پر انبیاء اور شہداء کو رشک آئے گا۔

حجۃ الوداع کے سلسلے میں بھی ان کی ایک روایت ہے جیسا کہ اور بعض دوسری احادیث آپ سے مروی ہیں، مثلاً طہارت کے سلسلے میں ان کی روایت ہے۔ زید ابو سلام سے اور ابو سلام ابو مالک اشعری سے اور ابو مالک حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا (الطهور شطر الایمان)۔

جس حدیث کی ہم تشریح کر رہے ہیں یہ ایسی حدیث ہے جو بہت سے معانی پر مشتمل ہے۔ آپ کو حدیث نبوی کی نشر و اشاعت اور سنّتِ مبارکہ کو عملی تطبیق دینے

سے بڑا شوق و شغف تھا، اسی وجہ سے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ میں اس لیے آیا ہوں کہ تم کو سکھاؤں اور تم کو اس طرح نماز پڑھاؤں جس طرح حضورؐ ہم کو نماز پڑھایا کرتے تھے اس کے بعد انہوں نے پانی کا ایک لگن منگایا، پہلے تین مرتبہ اپنے ہاتھ دھوئے، مضمضہ کیا، استنشاق فرمایا اور تین مرتبہ اپنا چہرہ دھویا، دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھویا، سر اور کان کا مسح کیا، اپنے دونوں قدم دھوئے پھر نماز پڑھی اور پھر حدیث بیان فرمائی۔

چوتھی حدیث کے راوی ــــ حضرت ابورقیہ تمیمؓ

ابورقیہ تمیم بن خارجہ بن خزیمہ لخمی فلسطینی نے بیت لحم نامی گاؤں میں جہاں کے اکثر باشندے مسیحی تھے، پرورش پائی۔ تمیم کی پرورش و پرداخت اِن نصرانیوں میں ہوئی جہاں وہ اُن کی کتابیں پڑھتے اور ان کے واقعات اور قصے سُنتے اس کے بعد ۹ھ میں مدینہ منورہ میں ایک وفد کے ساتھ خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے، اور آپؐ کے شرف صحبت میں رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسیح دجال کے بارے میں بیان کیا، حضورؐ نے ان کے بیان کو صحیح مانا اور مسلمانوں سے منبر پر بیٹھ کر ان کا تعارف اس طرح کرایا، تمیم داری ایک نصرانی آدمی تھے، آئے، بیعت کی اور مسلمان ہوگئے اور ہم سے ایسی بات بیان کی جو اُس کے مطابق ہے جو میں تم سے مسیح دجال کے بارے میں بیان کیا کرتا تھا[۱] اس وقت سے حضرت تمیم حضرت عثمان غنیؓ کے حادثۂ شہادت تک برابر مدینہ منورہ ہی میں رہے، اس حادثے کے بعد شام چلے گئے۔ حضرت تمیم جب اسلام لائے تو آپ نے عرض کیا، اللہ کے رسولؐ اللہ تعالیٰ آپؐ کو تمام روئے زمین پر غلبہ عطا فرمائے گا، آپؐ ہمارا گاؤں بیت لحم ہم کو ہبہ فرما دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: وہ تم کو دے دیا اور اس کے بارے میں ان کو تحریر لکھ دی، حضرت لیث فرماتے ہیں، حضورؐ نے ان سے فرمایا تمہیں اس کو بیچنے کا اختیار نہ ہوگا، فرمایا: پھر تو وہ قیامت تک اس کے باشندوں ہی کے قبضے میں رہے گا، قرآن کریم میں ایک آیت ہے جو حضرت تمیم کے علمی مرتبے کی طرف اشارہ کرتی ہے، وہ آیت یہ ہے (ومن عندہ علم الکتاب - رعد - ۴۵)

---

[۱] صحیح مسلم

قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے سلمان فارسیؓ، ابن سلامؓ اور تمیم داریؓ مراد ہیں۔ تمیم ان حضرات میں تھے جو حضرت عثمانؓ، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ کے ساتھ قرآن کریم کے جمع کرنے میں شریک تھے۔

حضرت تمیم اپنے زہد و تقویٰ میں مشہور تھے۔ بڑے عبادت گزار تھے اور کثرت سے تلاوتِ کلام پاک کیا کرتے تھے، ابو قلابہؒ ابو مہلب کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ تمیم داری سات دن میں قرآن پاک ختم کیا کرتے تھے، وہ صفائی ستھرائی اور نفاست میں بھی مشہور تھے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ تمیم داری نے ایک چادر ایک ہزار روپے میں خریدی تو اس کو زیب تن کر کے نماز پڑھی، بعض لوگوں کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک ہزار کا ایک جوڑا خریدا جس کو لیلۃ القدر میں پہنا کرتے تھے، ۴۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان سے مروی روایتوں کی تعداد ۱۸ تک پہنچتی ہے، ان میں سے صحیح مسلم میں صرف ایک حدیث ہے۔

———— ٭ ————

پانچویں حدیث کے راوی ۔ حضرت ابوسعید خدری رضؓ

سعد بن مالک بن سنان بن ثعلبہ بن عبد بن حارث بن خزرج کنیت ابوسعید ہے، امام و مجاہد، مدینہ منورہ کے جواں مردوں میں سے ایک، جن سات صحابہ رضؓ نے حضورؐ سے کثرت سے حدیثیں بیان کی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہیں۔

غزوۂ احد کے دن ان کے والد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو جنگ میں جانے کے لیے پیش کیا، ان کی عمر اس وقت ۱۳ سال کی تھی جو غزوہ میں جانے کی عمر نہیں تھی، مالکؓ اپنے بیٹے سعد کی قوت و طاقت بیان کرنے لگے اور کہنے لگے کہ یہ جنگ میں شرکت کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن حضورؐ نے کم سنی کے سبب ان کو واپس کر دیا، جنگ میں جانے کی اجازت نہیں دی، حضرت ابوسعید کے پدر بزرگوار اسی معرکے میں شہید ہوئے لیکن ابوسعیدؓ کو غزوۂ خندق اور بیعت عقبہ ثانیہ میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ مجموعی طور پر وہ ۱۲ غزوات میں شریک ہوئے، حضورؐ سے حدیثیں بیان کیں جو تعداد میں بہت اور خوب ہیں، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور دیگر صحابۂ کرام سے بھی روایتیں بیان کی ہیں، وہ ان صحابہ میں شمار ہوتے ہیں جو فقیہ و مجتہد تھے؛ آپؓ ان حضرات میں تھے جنہوں نے حضورؐ سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے۔ یہاں ہم ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس سے حضرت ابوسعید کے مقام و شخصیت پر روشنی پڑے گی۔

اسماعیل بن عباس سے مروی ہے کہ ہم کو عقیل بن مدرک نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے مرفوعاً بیان کیا کہ تم تقویٰ (خدا کے پاس و لحاظ) کو حرز جان بنالو کہ تقویٰ ہی ہر عمل خیر کا سرچشمہ ہے، تم جہاد کو اپنے اوپر ضروری سمجھو کہ یہی اسلام کی رہبانیت (دنیا سے قطع

تعلق) ہے، تم اللہ تعالیٰ کے ذکر اور تلاوت قرآن پاک کو لازم کرلو، کہ یہی آسمان والوں میں تمہاری خوشی و شادمانی ہے، اور زمین والوں میں تمہاری یاد و ذکر خیر، اور تم خاموشی کو اپنا شعار بنا لو سوائے ایسے مواقع کے جہاں اعلان حق کرنا ہو یا حق کو بیان و واضح کرنا ہو، اِس حدیث کے الفاظ سے حضرت ابو سعید خدریؓ کی عظیم شخصیت، اصابت رائے اور پختہ خیالی پر روشنی پڑتی ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ نے زمانۂ نبوت کو عین جوانی میں پوری ہوش مندی اور بیدار مغزی کے ساتھ گزارا، اور دیگر روایات سے بھی ان کی گوناگوں شخصیت روشن و نمایاں ہوتی ہے۔ سلیمان ابو داؤد طیالسی نے ہم کو بتایا، فرماتے ہیں ہم سے شعبہ نے بیان کیا، پہلے انہوں نے کہا: ہم نے علی بن حکم سے سُنا: وہ ابو نضرہ اور ابو نضرہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ کے صحابہؓ جب بیٹھ کر باتیں کرتے تو ان کی گفتگو فقہ سے متعلق ہوتی، ورنہ ہوتا یہ کہ کسی کو قرآن کریم پڑھنے کو کہتے، وہ کوئی سورہ پڑھتا یا کوئی شخص ان حضرات میں سے قرآن پاک کی تلاوت کرتا، یہ ایسے پختہ اور صاحب رائے شخص کی روایت ہے جو عہد نبوی کے شب و روز کی تصویر کشی کرتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا عہد رسولؐ کے قرآنی حلقوں کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے صحابۂ کرام اس کو نظر آرہے ہیں، ان مجلسوں اور محفلوں کی تصویر نگاہوں میں گھوم رہی ہے، ان عابد و زاہد صحابی حضرت ابو سعید خدریؓ کا انتقال ۷۴ھ میں ہوا، انہوں نے روایات حدیث کا ایک قیمتی سرمایہ چھوڑا۔ چنانچہ مسند ابو سعید میں ایک ہزار ستر (۱۰۷۰) حدیثیں موجود ہیں، ان میں سے امام بخاری نے سولہ (۱۶) اور امام مسلم نے باون (۵۲) حدیثیں لی ہیں۔

چھٹی حدیث کے راوی ـــ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

آپ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کے صاحب زادے ہیں۔ آپ کی والدہ ام الفضل لبابہ بنت حارث ہلالیہ ہیں، جو ام المومنین حضرت میمونہ کی بہن ہیں۔ آپ کی ولادت ہجرت مدینہ سے تین سال قبل ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو دعا دی تھی (اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْہُ التَّاْوِیْلَ) اے اللہ تو ان کو دین کی سمجھ اور فقہ اور باتوں کی کل بٹھانا سکھادے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب محمدؐ کی دعا قبول فرمالی اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اپنی علمی جلالت شان میں مشہور ہوئے، فقہی مسائل میں دقیقہ رسی کے اس مرتبے کو پہنچ گئے کہ استفتا اور روایت کے لیے دور دور سے لوگ سفر کرکے ان کے پاس حاضر ہوتے، وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بعد ۳۵ سال تک فتویٰ کا کام انجام دیتے رہے۔ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ آپ ہی کے بارے میں فرماتے ہیں (حضورؐ کی اس دُعا کی برکت سے جس کا اُوپر ذکر ہوا، ہم نے ابن عباسؓ سے بڑھ کر صاحب علم نہیں دیکھا)۔

حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ آپ ہی کے بتائے ہوئے مسائل کی روشنی میں فیصلے فرماتے تھے، اسی طرح ہم نے ان سے بڑھ کر فقیہ و مفسر قرآن، ادب و شعروشاعری، حساب اور فرائض کا جاننے والا کسی اور کو نہیں پایا۔ وہ ہفتے میں ایک دن تاویل کلام و تفسیر کے لیے بیٹھتے تھے، ایک دن شعروشاعری، اور ایک دن عربوں کی لڑائیاں بیان کرنے کے لیے، ہم نے کبھی بھی کسی عالم کو نہیں دیکھا کہ ان کے سامنے بیٹھا ہو اور اپنی کم مائگی نہ محسوس کی ہو، جو سائل بھی آتا اپنے سوال کا جواب پاتا۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ حضرت ابنِ عباسؓ اپنی علمی علو شان کی وجہ سے بحرالعلوم کہلاتے تھے۔

حضرت طاؤس کہتے ہیں کہ تقریباً پچاس صحابۂ کرام سے ملاقات کا مجھے شرف حاصل ہوا، جب حضرت ابن عباسؓ کچھ بیان کرتے تو باقی اصحابِ رسول ان کی مخالفت کرتے، حضرت ابن عباسؓ اپنی بات کی تائید و وضاحت فرماتے رہتے یہاں تک کہ وہ حضرات تسلیم کر لیتے، مُراد یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کثرتِ روایت، قوتِ کلام اور دلائل پیش کرنے میں سب پر فائق تھے۔

حضرت ابن عباسؓ سے کسی نے سوال کیا کہ علم کا یہ اُونچا مرتبہ کس طرح آپ کو حاصل ہوا؟ تو جواب میں فرمایا (بہت پوچھنے اور سوال کرنے والی زبان اور زودفہمی کے ذریعہ) کہ حضرت عمر بن الخطابؓ اکابر صحابہؓ کے ساتھ مجھ سے بھی مسائل پوچھتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ غزوۂ حنین، طائف، فتح مکہ اور حجۃ الوداع میں موجود تھے، حضرت ابن ابی سرح کے ساتھ افریقہ کی فتح میں بھی شریک تھے، جنگ جمل و صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے، حضرت علیؓ نے ان کو بصرہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا تھا، اخیر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی، ان کے والد اور دادا کے ساتھ بھی یہ حادثہ پیش آیا تھا کہ اخیر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی۔ ۶۸ھ میں طائف میں وفات پائی، آپ کی نماز جنازہ ابن حنفیہ نے پڑھائی۔

ساتویں حدیث کے راوی ــــ حضرت انس بن مالک رضؓ

انس بن مالک رضؓ بن نضر بن ضمضم بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن نجار۔ حضرت انس رضؓ اور حضورؐ کی پردادی، حضرت عبدالمطلب کی والدہ سلمٰی بنت عمرو ابن زید کا سلسلۂ نسب مل جاتا ہے۔ حضرت انس رضؓ کی والدہ ام سلیم بنت ملحان نے اپنے بیٹے انس کا ہاتھ پکڑا اور انہیں لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا، اے اللہ کے رسولؐ میرا یہ لڑکا کاتب ہے اس کو آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئی ہوں (اس کو قبول فرمالیں)۔ حضرت انس رضؓ کی کنیت ابوحمزہ تھی، حضورؐ نے ان کی کنیت ابوبقلہ رکھی اس لیے کہ یہ اسی کا کاروبار کرتے تھے، حضرت انس رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نو سال تک آپؐ کی خدمت میں رہا، ہم نے جو کام بھی کیا آپؐ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ تم نے غلط کیا یا بہت بُرا کیا، آپؐ نے حضرت انس رضؓ کو مال و اولاد کی کثرت کی دعا دی آپؐ کی اس دُعا کی ایسی برکت ظاہر ہوئی کہ حضرت انس رضؓ کے ۸۰ بیٹے ہوئے اور ۲ بیٹیاں جن میں سے ایک کا نام حفصہ اور دوسری کا نام ام عمرو تھا، مال میں برکت کا یہ حال تھا کہ اُن کا ایک باغ تھا جو سال میں دو مرتبہ پھل دیتا تھا، اس باغ میں ایک خوشبودار پودا تھا جس سے مُشک کی خوشبو آتی تھی، اپنی کم عمری کی وجہ سے حضرت انس رضؓ غزوہ بدر میں نہیں حاضر ہو سکے تھے، لیکن بدر کے بعد بہت سے غزوات میں شریک ہوئے، جب حضرت ابوبکر رضؓ نے حضرت عمر رضؓ سے حضرت انس رضؓ کو بحرین کا گورنر بنانے کے سلسلے میں مشورہ کیا تو حضرت عمر رضؓ نے ان کی تائید کی اور فرمایا وہ نہایت سمجھ دار پڑھے لکھے ہیں اور حضورؐ کی خدمت میں عرصہ دراز تک رہنے کی وجہ سے تقویٰ اور پرہیزگاری میں مسلّم ہیں، حضرت ابوہریرہ رضؓ فرماتے ہیں کہ ابوسلیم یعنی حضرت انس رضؓ سے بڑھ کر حضورؐ جیسی

نماز پڑھتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا، ابن سیرین حضرت انسؓ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ سفر و حضر میں سب سے بہتر نماز پڑھنے والے تھے۔

صحابۂ کرامؓ میں جو حضرات کثرتِ روایت میں مشہور ہیں ان میں سے تیسرا نمبر حضرت انسؓ کا ہے، انہوں نے ۲۲۸۶ حدیثیں روایت کی ہیں۔ صحابۂ کرامؓ میں سب سے آخر میں بصرہ میں ان کی وفات ہوئی، ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے لیکن راجح قول یہ ہے کہ ۹۳ھ میں سو سال سے زیادہ عمر میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے دن اہلِ علم تاریخ دانوں نے کہا کہ آدھا علم ختم ہوگیا۔ ان کی سب سے صحیح روایتیں وہ ہیں جو مالک نے زہری سے روایت کی ہیں۔

آٹھویں حدیث کے راوی — حضرت ابوہریرہؓ

حضرت ابوہریرہؓ معروف ومشہور صحابۂ کرام میں سے ہیں، ابوہریرہ اُن کی کنیت ہے جو حضورؐ نے رکھی ہے۔ ان کا اصل نام (عبدالرحمٰن بن صخر دوسی) ہے۔ آپ کا شمار ان کبار صحابہؓ میں ہے جنہوں نے اُمّت مسلمہ کے لیے دین کے زبردست رکن (سنّتِ مبارکہ) کو محفوظ کیا، ان جیسے ثقہ حضرات ہی نے سنّت کو اُمّتِ مسلمہ تک پہنچایا اور پھر اُن کے بعد آنے والے دیگر محدثین نے یہ مبارک خدمت انجام دی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے تمام صحابۂ کرام میں سب سے زیادہ روایتیں کی ہیں، اس لیے کہ انہوں نے سب کچھ چھوڑ کر ہمہ وقت حضورؐ کی خدمت میں رہنا طے کر لیا تھا اور ہر وقت آپؐ کے ساتھ رہتے تھے، حتیٰ کہ احادیث پاک کی روایت کے ان کے شوق عظیم کی خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت دی اور قوتِ حافظہ کے باقی رہنے کی ان کو دعا دی چنانچہ آپؐ کی اس دعا کی برکت سے حضورؐ سے جو کچھ بھی سُنتے اس کو یاد کر لیتے — ان سے ۵۳۰۴ حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔ ہجرت کے ساتویں سال جس سال غزوۂ خیبر پیش آیا تھا، اسلام لائے اور ۵۷ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ بقیع شریف میں مدفون ہوئے۔ رضی اللہ عنہ۔

دسویں حدیث کے راوی ــ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ

عبداللہ بن عمروؓ بن العاص، یہ عبادلۂ اربعہ میں سے تھے، امام وقت، عالم، عبادت گزار صحابیٔ رسولؐ اور صحابیٔ رسولؐ کے صاحب زادے، ابو محمد کنیت، والدہ رائطہ سہمیہ جو حجاج کی بیٹی تھیں۔ اپنی والدہ سے پہلے ایمان اسلام لائے اور فتح مکہ سے قبل ہجرت فرمائی، زُہد و تقویٰ اور کثرتِ صوم و صلوٰۃ میں مشہور تھے، حضورؐ کی احادیث روایت کرنے میں مشغول رہے، چناں چہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سات سو حدیثیں روایت کی ہیں، حضورؐ سے کتابت کی اجازت ملنے کے بعد فرمایا کرتے تھے، میں نے حضورؐ سے اجازت مانگی کہ میں جو کچھ آپؐ سے سُنتا ہوں اس کے لکھنے کی اجازت دے دیجیے، حضورؐ نے اجازت دے دی تو میں نے آپؐ کی احادیث کو لکھنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے اس صحیفے (یعنی کتابچہ یا یادداشت) کو "صادقہ" کہا کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اس کے بارے میں فرماتے ہیں، حضورؐ کی حدیثوں کو مجھ سے زیادہ یاد کرنے والا کوئی نہیں تھا، ہاں عبداللہ بن عمرو بن العاص اس بارے میں میرے شریک تھے مگر وہ احادیث رسولؐ کو لکھا کرتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔

حضرت عبداللہؓ نے حضرت عمرؓ، حضرت ابو درداءؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ وغیرہ حضرات سے حدیثیں روایت کی ہیں، امام بخاری نے ان کی آٹھ حدیثیں اپنی کتاب میں لی ہیں اور امام مسلم نے بیس۲۰ حدیثیں لی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص نے فرمایا، میں نے قرآن پاک کو جمع کیا اور پورے قرآن کو ایک ہی رات میں پڑھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "دو مہینے میں ایک قرآن ختم کیا کرو۔" میں نے عرض کیا، اللہ کے رسولؐ مجھے اپنی جوانی کی قوت سے فائدہ

اُٹھانے دیجیے، تو آپؐ نے فرمایا: "اچھا تو بیس دن میں ختم کیا کرو"، انہوں نے عرض کیا مجھے فائدہ اُٹھانے دیجیے، تو آپؐ نے فرمایا: "تو سات راتوں میں ختم کیا کرو"۔ پھر میں نے عرض کیا، اللہ کے رسولؐ مجھے فائدہ اُٹھانے دیجیے تو آپؐ نے انکار فرمایا۔ یہ حدیث نسائی نے ذکر کی ہے۔

اسی طرح سے جب انہوں نے مسلسل روزہ رکھنے کے بارے میں اصرار کیا تو آپؐ برابر انکار فرماتے رہے، یہاں تک کہ آخر میں فرمایا، بس ایک دن روزہ رکھو اور ایک دن افطار کرو، جیسا کہ ہمارے بھائی داؤد روزہ رکھا کرتے تھے۔ یہ جلیل القدر صحابی جب بوڑھے ہوگئے تو فرمایا کرتے تھے، کاش کہ میں نے حضورؐ کی نصیحت کو مان لیا ہوتا۔ انھیں سے مروی ہے، فرمایا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میری ایک اُنگلی میں گھی اور دُوسری میں شہد ہے اور میں ان دونوں کو چاٹ رہا ہوں، صبح کو میں نے حضورؐ سے اپنا یہ خواب بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا، تم دونوں کتابیں توریت اور قرآن پڑھا کرتے ہو۔ چناں چہ وہ ان دونوں کتابوں کو پڑھا کرتے تھے۔ ان کی سب سے صحیح مسند کی وہ حدیث ہے جس کو عمر بن شعیب اپنے والد اور دادا عبداللہ سے بیان کرتے ہیں، اور عبداللہ بن ابو ملیکہ سے مروی ہے کہ عبداللہ بن عمروؓ، مخمس سے جمعہ پڑھنے آتے تھے، وہ فجر کی نماز پڑھ کر حطیم کی طرف اُٹھ جاتے اور تسبیح و تکبیر میں مشغول رہتے پھر حطیم کے اندر چلے جاتے تھے اور لوگ آکر ان کی مجلس میں بیٹھتے۔

حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص حرم سے باہر حلّ میں اپنا خیمہ لگاتے تھے اور حرم میں اپنا مصلّیٰ رکھتے تھے، ان سے پوچھا گیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو فرمایا: اس لیے کہ کسی فروگذاشت کا حرم کے اندر ہونا حلّ کے مقابلے میں زیادہ سخت ہے۔ ۶۵ھ میں شام میں ان کی وفات ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ۸۲ سال تھی۔

بارہویں حدیث کی راوی ۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ

ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ صدیقہ صحابیہ رسولؐ، خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کی صاحب زادی تھیں ۔ بعثت کے چوتھے یا پانچویں سال پیدا ہوئیں، وہ چھ یا سات سال کی تھیں جب حضورؐ نے ان سے نکاح فرمایا اور ہجرت کے پہلے سال شوال میں نو سال کی عمر میں رخصتی ہوئی، اِن کے سوا حضورؐ نے اور کسی کنواری سے شادی نہیں کی ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو اپنی فضیلت میں ذکر فرمایا ہے، اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری براءت آسمان سے اُتاری ہے، آپؐ میرے ساتھ ہوتے تھے اور وحی نازل ہوتی تھی، میں اور حضورؐ دونوں ایک برتن سے غسل کرتے تھے، آپؐ نماز (یعنی تہجد) پڑھ رہے ہوتے تھے اور میں آپؐ کے سامنے چوڑائی میں لیٹی ہوتی تھی، آپؐ کا وصال میرے حجرے میں میری گود میں ہوا ۔ میں ازواجِ مطہرات میں آپؐ کو سب سے زیادہ محبوب تھی ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا علم و مرتبہ میں سب عورتوں سے افضل ہیں ۔ حضرت مسروق سے روایت ہے، فرمایا، میں نے بڑے بڑے صحابہ رضؓ کو آپ سے فرائض کے بارے میں مسئلہ پوچھتے ہوئے دیکھا ہے ۔

حضرت عطاء بن رباح فرماتے ہیں: حضرت عائشہ رضؓ سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ صاحبِ علم، اور سب سے بہتر رائے رکھنے والی تھیں ۔

حضرت ابوموسیٰ نے فرمایا، جب ہمارے سامنے کوئی مشکل مسئلہ آتا تو حضرت عائشہ رضؓ کی طرف رجوع کرتے اور ان کے پاس اس مسئلہ سے متعلق علم ہوتا، انہیں خصوصیات

کی وجہ سے حضرت عائشہؓ ہر اس مسلمان عورت کے لیے اچھی مثال ہیں جو شرف و فضیلت اور بلند مرتبے کی جویا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مرفوعاً مروی ہے "عورتوں پر حضرت عائشہؓ کو وہ فضیلت حاصل ہے جو ثرید کو دوسرے تمام کھانوں پر حاصل ہے"۔

ستائیس[۲۷] رمضان المبارک، اور ایک روایت میں ہے ستائیسویں شب میں آپؓ کا انتقال ہوا۔ بقیع میں مدفون ہوئیں۔ آپؓ سے ایک ہزار دو سو دس[۱۲۱۰] حدیثیں مروی ہیں۔

چودھویں حدیث کے راوی ۔ سفیان بن عبداللہ رض

سفیان بن عبداللہ ۔ بن ابی ربیعہ بن حارث ۔ بن مالک بن حطیط ابن جشم ۔ بن ثقیف ثقفی طائفی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رض کے عہد خلافت میں طائف کے گورنر تھے ۔ حضرت عمر رض نے جب عثمان بن ابی العاص کو طائف کی گورنری سے معزول فرمایا تو انہیں وہاں کا گورنر بنایا ۔ ان سے متعدد تابعین نے احادیث روایت کی ہیں ، مثلاً ان کے بیٹے عبداللہ و عروہ بن زبیر، محمد بن عبداللہ بن معاذ ، نافع بن جبیر رحمہم اللہ اجمعین ۔

پندرہویں حدیث کے راوی ـــ نواس بن سمعانؓ

حضرت نواس بن سمعان بن خالد بن عمرو بن قرط بن عبد اللہ بن ابی بکر کلابی رضی اللہ عنہ۔ ان کا شمار شامی صحابہؓ میں ہے یعنی وہ صحابۂ کرام جنہوں نے شام میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے والد سمعان بن خالد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کے لیے دعا فرمائی۔ انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں دو پاپوش پیش کیے، آپؐ نے اس کو قبول فرمایا۔ انہوں نے آپؐ سے اپنی بہن کی شادی کر دی۔ جب وہ حضورؐ کی خدمت میں پہنچی تو آپؐ سے پناہ چاہی، اس کی اس حرکت پر آپؐ نے اسے چھوڑ دیا، یہ وہی کلابی خاتون ہیں جن کا قصہ مشہور ہے کہ اس میں بڑا اختلاف ہے۔

حضرت نواسؓ نے حضورؐ سے متعدد حدیثیں روایت کی ہیں، انہیں میں سے وہ حدیث ہے جس میں دجال اور اس کی صفات اور حالات کا ذکر ہے۔ ان کی تاریخِ وفات کا پتا نہیں چلتا۔

سولہویں حدیث کے راوی ــــ حضرت عبداللہ بن عمرؓ

حضرت عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما، یہ عبادلہ اربعہ میں سے تھے۔ آپ کی کنیت ابوعبدالرحمٰن تھی، بعثت نبوی سے ایک سال قبل آپ کی ولادت ہوئی، وہ جب کہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ اپنے والد حضرت عمرؓ کے ساتھ مکہ ہی میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور حضرت عمرؓ سے پہلے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی، لیکن غزوۂ بدر میں نہیں شریک ہوسکے اس لیے کہ ابھی کم سن تھے، جنگ میں شرکت کی عمر کو نہیں پہنچے تھے، غزوہ احد میں وہ چودہ سال کے ہوچکے تھے، لیکن حضورؐ نے ان کو چھوٹا قرار دیا، اس کے بعد غزوۂ خندق پیش آیا جس میں وہ پندرہ سال کے ہوچکے تھے، لہذا آپؐ نے اس غزوہ میں شرکت کی اجازت دے دی، اس کے بعد وہ آپؐ کے سریوں میں سے کسی سریہ میں پیچھے نہیں رہے، سب میں شریک ہوئے، آپؓ کی ہمشیرہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ان کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا (تمہارے بھائی بڑے اچھے آدمی ہیں، کاش وہ تہجد پڑھتے)۔

آپؐ کے اس ارشاد کے بعد پھر انہوں نے کبھی تہجد نہیں چھوڑا، ان کا شمار فقہائے صحابہؓ اور فقیہوں میں تھا، آپؓ زاہدوں میں شمار ہوتے تھے۔ فتنے کے زمانے میں الگ تھلگ رہے، حضرت امیر معاویہؓ کے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوئے، ہر سال حج فرمایا کرتے تھے، حتیٰ کہ آپؓ نے ساٹھ [60] حج کیے، عمرے تو ایک ہزار کیے، ان کا شمار بہت عبادت گزاروں میں تھا۔ ۷۳ھ میں مکہ مکرمہ میں چھیاسی [86] سال کی عمر میں وفات پائی، انہیں شہادت کی موت نصیب ہوئی، اس طرح کہ حجاج ان کے ساتھ ایک مرتبہ بد اخلاقی سے پیش آیا، تو انہوں نے اس سے کہا، تم ایک احمق ہو جو مسلط کردیے گئے ہو،

یہ بات حجاج کو اتنی ناگوار گزری کہ اس نے ایک شخص کو حکم دیا، اس نے اپنے نیزے کو زہر میں بجھایا اور دورانِ طواف آپؓ کے قدم پر رکھ دیا، زخم پک گیا اور زہر سرایت کر گیا جس سے آپؓ کا انتقال ہو گیا۔ مکہ مکرمہ میں آپؓ کی تدفین عمل میں آئی۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

———— ٭ ————

انیسویں حدیث کے راوی ـ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ

اس حدیث کے راوی جلیل القدر صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ہیں ان کا نام عبداللہ بن قیس تھا ـ آپ کا تعلق ان اشعریوں کے قبیلے سے تھا جس کی تعریف میں حضورؐ نے فرمایا: "لڑائی کے اندر جب فقر و فاقہ سے دوچار ہوتے یا اُن کے بچوں کا کھانا پینا مدینہ منورہ میں ختم ہوجاتا تو ان کے پاس جو کچھ ہوتا ایک جگہ جمع کرتے پھر اس کو آپس میں ایک برتن سے برابر تقسیم کرلیتے، وہ ہم میں سے ہیں اور ہم اُن میں سے ہیں"۔

حضرت ابوموسیٰ ؓ اسلام لائے اور پھر اپنے ملک واپس چلے گئے۔ اور اس کے بعد اپنے قبیلے کے تقریباً پچاس ۵۰ آدمیوں کو لے کر ایک کشتی میں سوار ہوکر مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے لیکن ہوا کے رُخ نے ان کو بادشاہ نجاشی کے پاس حبشہ پہنچادیا۔ ان کا حبشہ پہنچنا اس وقت ہوا جب حضرت جعفرؓ اور ان کے ساتھی واپس ہو رہے تھے تو حضرت ابوموسیٰؓ بھی انھیں کے ساتھ مع اپنے پچاس ۵۰ رفقاء کے مدینہ منورہ تشریف لائے ـ حضرت جعفرؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ دونوں حضرات کی کشتیاں فتح خیبر کے بعد ایک ساتھ مدینہ منورہ پہنچیں ـ

حضورؐ نے ان کو یمن کے بعض علاقوں کا عامل بنایا۔ آپؐ کے بعد حضرت عمرؓ نے آپ کو بصرہ کا عامل بنایا ـ چناں چہ آپ نے اہواز اور اصبہان کو فتح کیا ـ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں کوفہ کے گورنر ہوئے ـ آپ قرآن شریف بڑے دل کش انداز میں پڑھتے تھے ـ ایک رات آپ قرآن مجید پڑھ رہے تھے ـ حضورؐ نے سُنا تو فرمایا (تم کو آلِ داؤد کے باجوں میں سے ایک باجا عطا کیا گیا ہے) ـ

حضرت عمرؓ جب ان کو دیکھتے تو فرماتے "ابو موسیٰ تم ہمیں ہمارے رب کی یاد دلاؤ"، اس کے بعد حضرت ابو موسیٰؓ قرآن کریم پڑھنے لگتے۔ حضرت ابو موسیٰؓ ہی ہیں جنہوں نے اہل بصرہ کو مسائل بتائے اور قرآن کریم پڑھایا۔

ابن مدینی فرماتے ہیں: "اُمت کے قاضی چار ہیں، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابو موسیٰؓ اور زید بن ثابتؓ۔

اکیسویں حدیث کے راوی — حضرت جابر بن عبداللہؓ

حضرت جابر بن عبداللہ بن عمرو بن حزام بن کعب بن غنم بن سلمہ، ان کا اور ان کے ماقبل مذکور دونوں کا سلسلہ نسب غنم بن کعب پر مل جاتا ہے یہ دونوں حضرات انصاری اور سلمی ہیں، اپنے والد کے ساتھ عقبۂ ثانیہ میں جب کہ ابھی بچے تھے شریک ہوئے، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ غزوہ بدر میں شریک تھے اور بعض کا کہنا ہے کہ نہیں شریک ہو سکے تھے، ایسے ہی غزوہ احد کے بارے میں بھی اختلاف رائے ہے۔

زکریا نے ہم کو بتایا کہ ابو زبیر نے ہم سے حدیث بیان کی کہ انہوں نے حضرت جابر کو کہتے ہوئے سنا کہ میں نے حضورؐ کے ساتھ دس غزوات میں شرکت کی۔ اور حضرت جابر نے فرمایا: میں غزوہ بدر و احد میں نہیں شریک ہوا، مجھ کو میرے والد نے روک دیا۔ جب ہمارے والد معرکہ احد میں شہید ہو گئے تو میں کسی غزوے میں حضورؐ کے پیچھے نہیں بیٹھا۔ حضرت علیؓ کے ساتھ صفین کی جنگ میں شریک ہوئے، اخیر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔

بیعت عقبہ میں شریک ہونے والوں میں یہ آخری صحابی تھے جن کا مدینہ منورہ میں انتقال ہوا، عقبہ میں جو لوگ تھے ان میں حضرت جابر سب سے چھوٹے تھے، آپ کا شمار ان صحابۂ کرامؓ میں تھا جو زیادہ حدیثیں بیان کرتے تھے اور سنّت رسولؐ کے زیادہ پابند تھے، حضرت جابر سے محمد بن علی بن الحسین، عمرو بن دینار ابو زبیر مکی، حضرت عطاء، مجاہد وغیرہ نے روایت کیا ہے، حماد بن سلمہ نے ہم سے ابو زبیر کے حوالے سے کہ انہوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے کہ اونٹ والی رات میں

رسول اللہ ؐ نے میرے لیے ۲۵ بار استغفار فرمایا ہے۔ اُونٹ والی رات سے مُراد وہ رات ہے جس میں اُنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اُونٹ خریدا، اس شرط پر کہ مدینہ منورہ تک وہ سواری کریں گے، یہ واقعہ ایک غزوہ میں پیش آیا۔ آپ کی وفات ۷۴ھ میں ہوئی، ان کی عمر اس وقت ۹۴ سال تھی۔

تیئسویں حدیث کے راوی ــ حضرت عویمر بن مالک رضؓ

آپ کا نام عویمر تھا۔ سلسلۂ نسب اس طرح ہے، عویمر بن مالک بن زید بن قیس بن امیہ بن عامر بن عدی بن کعب خزرجی۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کا نام عامر ہے، عویمر اُن کا لقب تھا۔

یہ کچھ تاخیر سے اسلام لائے، اپنے علاقے کے لوگوں میں سب سے اخیر میں اسلام لائے، اور پختہ مسلمان رہے، کسی مرحلے میں شک و تذبذب نہیں رہا، وہ فقیہ اور حکیم و دانا تھے۔ حضورؐ نے ان کے اور حضرت سلمان کے درمیان بھائی چارہ کرایا تھا آپ کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا: "عویمر ہماری اُمت کے حکیم ہیں"۔ حضورؐ کے ساتھ غزوۂ احد کے بعد بہت سے غزوات میں شریک ہوئے۔ غزوۂ احد میں ان کی شرکت کے بارے میں اختلاف ہے۔ انہوں نے حضورؐ سے کچھ احادیث روایت کی ہیں، مذکورہ حدیث بھی انہیں میں سے ہے۔ دنیا سے اُن کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، زاہدانہ زندگی گزارتے تھے۔ حضرت عثمان رضؓ کے عہد خلافت میں دمشق میں قاضی رہے، اور حضرت عثمان رضؓ کی شہادت سے دو سال قبل دمشق ہی میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہ۔

پچیسویں حدیث کے راوی ۔ حضرت ابواُسید مالکؓ

آپ کی کنیت ابواُسید، نام مالک، نسب اس طرح ہے مالک بن ربیعہ بن البدن بن عامر بن عوف ساعدی خزرجی۔ آپ اپنی کنیت یعنی ابواسیدؓ ہی سے مشہور ہیں۔ آپ غزوہ بدر و احد میں اور دیگر غزوات میں بھی حضورؐ کے ساتھ شریک رہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے قبل ہی نابینا ہوگئے تھے، انہوں نے حضورؐ سے بہت سی روایتیں کی ہیں، ان روایتوں کو صحابۂ کرام میں سے حضرت انس بن مالکؓ اور سہل بن سعدؓ وغیرہ نے آپ سے بیان کیا ہے۔ آپ کا انتقال ۶۰ھ میں ہوا بعض لوگ کہتے ہیں کہ ۶۵ھ میں ہوا، جب کہ آپ کی عمر ۷۵ سال تھی۔ رضی اللہ عنہ۔

چھبیسویں حدیث کے راوی — حضرت ابوذر رضؓ جندب بن جنادہ

اِس حدیث کے راوی ابوذر رضؓ جندب بن جنادہ بن قیس بن عمرو الغفاری ہیں، ان کی والدہ رملہ بنت وقیعہ بھی بنو غفار سے ہیں، حضرت ابوذر رضؓ کبار صحابہ رضؓ اور علماء میں سے تھے، بہت پہلے ایمان لائے تھے، ایمان لانے والوں میں پانچویں شخص تھے، اسلام لانے کے بعد اپنے وطن واپس گئے اور اپنی قوم میں اسلام کی دعوت کا کام کرتے رہے، پھر وطن ہی میں رہے حتی کہ ہجرت مدینہ کے بعد مدینہ منورہ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ ابوذر پر رحم فرمائے، تنہا چلیں گے، تنہائی میں انتقال ہوگا اور تنہا اُٹھائے جائیں گے۔" یہ بات آپؐ نے اس وقت فرمائی تھی جب غزوۂ تبوک میں حضرت ابوذر رضؓ کو لشکر کے پیچھے تنہا چلتے ہوئے دیکھا تھا، چناں چہ ان کا انتقال مقام ربذہ میں ۳۱ یا ۳۲ ہجری میں ہوا اور ان کی نمازِ جنازہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ نے پڑھائی۔

ستائیسویں حدیث کے راوی ـ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

اس حدیث کے راوی ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مسعودؓ بن غافل ہزلی ہیں، جو بنوزہرہ کے حلیف تھے، کبھی ان کی نسبت ایک باندی کی طرف کی جاتی ہے، اور ابن ام عبد کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ابن مسعودؓ اپنے والد کے انتقال کے بعد تلاش معاش میں ہذیل سے مکہ مکرمہ آئے اور وہاں عقبہ بن ابومعیط کی بکریاں چرانے کے کام میں مشغول ہوگئے، ان سے دو آدمیوں کی ملاقات ہوگئی۔ ان میں سے ایک صاحب نے بڑی اچھی اچھی باتیں کیں اور انہوں نے ان میں ایسی چیزیں دیکھیں جو ان کو پسند آئیں اور خوش ہوئے، اس کے بعد ان کو پتا چلا کہ یہ دونوں حضرات حضورؐ اور آپؐ کے صحابی حضرت ابوبکرؓ ہیں، یہ معلوم ہوتے ہی وہ عقبہ کے پاس آتے ہیں اور ان کی بکریاں ان کے پاس پہنچا کر حضورؐ کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں حتیٰ کہ آپؐ کی خدمت میں پہنچ جاتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ جو باتیں انہوں نے حضورؐ سے سُنی ہیں آپ ان کو سکھا دیں، پھر آپ ان کو سمجھاتے ہیں اور وہ سن کر داخلِ اسلام ہو جاتے ہیں اور ان سے حضورؐ فرماتے ہیں (تم سکھانے والے غلام ہو)۔ اس طرح عبداللہ بن مسعودؓ چھٹے مسلمان ہوتے ہیں وہ دونوں ہجرتوں میں شریک رہے، غزوہ بدر، اور اس کے بعد برابر غزوات میں شریک رہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ابوجہل نے بیت اللہ شریف میں قرآن پڑھنے کے سبب مارا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا بدلہ اس طرح چکایا کہ غزوہ بدر میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی نے ابوجہل کو موت کے گھاٹ اُتارا اور اس کے بعد کہا خدا کے دُشمن دیکھ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو ذلیل کیا۔ ابوجہل نے کہا، سُن اے بکری چرانے والے تو نے بڑا خطرہ

مول لے لیا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہمہ وقت آپؐ کے ساتھ رہتے تھے، کبھی آپؐ سے جُدا نہیں ہوتے تھے۔ ہر وقت حضورؐ کی خدمت میں رہنے کا اثر ان کے علم و فقہ میں ظاہر ہوا، وہ خود فرماتے ہیں، "خدا کی قسم قرآن کی جو آیتیں بھی نازل ہوئیں، مجھے معلوم ہے کہ کس مسئلہ میں نازل ہوئیں، ان کی شانِ نزول کیا تھی، اللہ کی کتاب کو تم میں سے کوئی بھی مجھ سے زیادہ نہیں جانتا، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی ایسا شخص موجود ہے جو مجھ سے زیادہ جانتا ہے اور اس کے پاس اُونٹ سوار آتے ہیں تو میں اس کے پاس جاتا، ایسا نہیں کہ میں تم میں سب سے بہتر ہوں۔" حضورؐ نے فرمایا: "جس کو یہ شوق ہو کہ وہ قرآن جیسا اُترا ہے اسی طرح پڑھے تو اس کو ابن ام عبد سے پڑھنا چاہیے۔" آپؐ نے فرمایا: "اگر میں کسی کو مسلمانوں سے مشورے کے بغیر امیر بناتا تو ابن ام عبد کو بناتا۔" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ شام کی فتوحات میں شریک رہے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو دینی مسائل و احکامات سکھائیں اور حضرت عمارؓ کو وہاں کا امیر بنا کر بھیجا اور فرمایا، یہ دونوں حضورؐ کے چنیدہ صحابہؓ میں سے ہیں، تم لوگ ان دونوں کی اقتدا کرو۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے ان کو کوفہ کا امیر بنایا پھر کچھ دنوں بعد معزول فرما دیا اور مدینہ آنے کا فرمان بھیجا وہ فوراً مدینہ آگئے، ذرا پس و پیش نہیں کیا اور فرمایا ان کی اطاعت لازم ہے، میں وہ پہلا شخص نہیں بننا چاہتا جو فتنہ کا دروازہ کھولے۔ پھر مدینہ منورہ ہی میں انتقال فرمایا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

اُنتیسویں حدیث کے راوی ــــ حضرت ابوبکرہ ثقفی رضؓ

اِس حدیث کے راوی ابوبکرہ ثقفی رضؓ ہیں، ان کا نام نفیع بن مسروح ہے۔ ایک قول کے مطابق نفیع بن حارث ہے، کلدہ بن عمرو بن علاج بن ابی سلمہ بن عبدالعزی بن عبدۃ بن عوف بن قیس سلسلۂ نسب ہے۔ ابوبکرہ کی والدہ حارث بن کلدۃ کی باندی سمیہ ہیں۔ حضرت ابوبکرہ کہا کرتے تھے، میں حضورؐ کا غلام ہوں۔ اپنا نسب بیان کرنے کو ناپسند کرتے تھے، ہوا یہ تھا کہ طائف کے دن وہ قلعے سے اُتر کر حضورؐ کے پاس آئے اور طائف کے کچھ غلاموں کے ساتھ ایمان لائے، ان سب غلاموں کو حضورؐ نے آزاد فرما دیا۔ اسی لیے وہ کہا کرتے تھے کہ میں حضورؐ کا غلام ہوں اور اُن کا شمار آں حضورؐ کے غلاموں میں ہوا۔ احمد بن زبیر فرماتے ہیں، میں نے یحییٰ بن معین کو کہتے ہوئے سُنا ہے کہ ہوذہ بن خلیفہ بکراوی نے اپنا نسب ابوبکرہ سے ملایا ہے، لیکن جب وہ ابی بکرہ کے پاس پہنچے، میں نے پوچھا کس کے فرزند ہو؟ تو کہا چھوڑو اس کے آگے نہ پوچھو، ابوبکرہ کہا کرتے تھے، میں تمہارا دینی بھائی ہوں، میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں اور اگر لوگ نہیں مانتے، میرا نسب معلوم کرنے پر اصرار ہے تو انہیں معلوم ہو کہ میں نفیع بن مسروح ہوں، وہ علماء صحابہ رضؓ میں سے تھے۔ انہیں نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کے خلاف شہادت دی تھی اور ان کی شہادت ثابت ہوگئی تھی جس کے نتیجہ میں حضرت عمر رضؓ نے حضرت شعبہ پر حد قذف جاری فرمائی تھی۔